خطیبِ آلِ محمدؐ

مولانا السید اظہر حسن زیدی اعلی اللہ مقامہ کی تقاریر کا مجموعہ

حصہ پنجم

مرتب
خضر عباس سید
ایم اے

پاک کتب خانہ ۔ اردو بازار ۔ راولپنڈی

نوجوانو!

خوب یاد رکھو!

دو شخصیتوں کا انسانیت پر بہت بڑا احسان ہے ایک شخصیت حضرت ابی طالبؑ ہیں اور دوسری شخصیت جناب زینبؑ ہیں۔

ہم تو ویسے ہی کہہ دیتے ہیں کہ کربلا میں اٹھارہ بنی ہاشم شہید ہوگئے حالانکہ ہاشم کی تو بہت وسیع اولاد تھی۔ گویا اولاد ہاشم میں سے یہ صرف اٹھارہ آل ابی طالبؑ تھے جو کربلا میں شہید ہوگئے۔

تاریخ عالم گواہ ہے کہ ایک دن ابیطالبؑ نے اپنے بھتیجے محمدؐ کو عالم گھبراہٹ میں دیکھ کر فرمایا۔

محمدؐ بیٹا! فکر نہ کرو۔ اگر تجھ پہ یا تیرے دین پہ کوئی حرف آیا تو میرے بچوں کے لاشے بھی تیری اور تیرے دین کی حفاظت کریں گے"

دوسری نقیب جناب زینبؑ ہیں جو کربلا کے ڈرامے کی اصل ہیرو ہیں۔ یاد رکھو! اگر حسینؑ ہیرو ہوتے تو ڈرامہ کربلا ہی میں ختم ہو جاتا مگر اصل ڈرامہ تو جب شروع ہوا جب زینبؑ قید ہوئی۔ گویا واقعہ کربلا کی اصل ہیرو زینبؑ ہیں جن کے تعاون سے آج ہم حسینؑ جیسی قیمتی شے سے متعارف ہو چکے ہیں۔

(خطیبِ آلِ محمدؐ)

خطبات

(زینبؑ و کلثومؑ)

★ دخترانِ علیؑ و فاطمہؑ کے خطبات کا مجموعہ

اہلِ نظر حضرات کے لئے دعوتِ فکر

★ شیعانِ حیدرؑ کرار کے لئے صحیفۂ کاملہ

★ تاریخِ اسلام کے طلباء کے لئے بہترین خزینہ

★ اربابِ منبر کے لئے شاندار تحفہ

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ)

ناشر ---- پاک کتب خانہ، راولپنڈی

پرنٹر ---- امتیاز فیاض پریس

چوک اردو بازار، لاہور

پانچواں ایڈیشن

ہدیہ: ۴۰/۰۰ روپے

ناشران:- پاک کتب خانہ، اردو بازار، راولپنڈی

خطیبِ آلِ محمدؐ

(حصہ ششم)

حضرت مولانا السید اظہر حسن زیدی مدظلہ العالی کی معرکۃ الآراء

تقاریر کا چھٹا مجموعہ

- مودۃ القربیٰ کا مکمل تعارف
- شہدائے کربلاؑ کی خونی داستان
- اہل علم حضرات کے لئے دعوتِ فکر
- اربابِ منبر کے لئے بے بہا خزینہ
- خطیبِ آلِ محمدؐ سیریز کی آخری پیشکش

سید محمد شاہ اکبر

عنقریب منظرِ عام پر آرہی ہے

(ناشران)

ترتیبِ مضامین

maablib.org

خطیب آلِ محمدؐ

(حصّہ پنجم)

انتساب

بحضور

صاحب العصر و الزمان

عجل اللہ تعالیٰ

maablib.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداۓ حق

اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلَام

"اللہ کا پسندیدہ دین اسلام ہے"

خداوند عزّاسمہٗ وجل جلالہٗ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ پر دُرُود و سلام

حضرات گرامیٔ قدر!

اللہ کا یہ فرمان ہے "اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلَام"

یاد رکھو! دین اور مذہب میں فرق ہے

دین کے معنٰی ہیں منزلِ مقصود" گویا وہ نقطۂ مرکزی جہاں ہم پہنچنا چاہتے ہیں ، دین کہلاتا ہے ۔ اور نقطۂ مرکزی تک پہنچنے کے راستے کو مذہب کہتے ہیں ۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ نقطۂ مرکزی ایک ہو مگر اس تک پہنچنے کے راستے مختلف ہوں ۔ لہٰذا مختلف رستوں سے نقطۂ مرکزی تک پہنچنے والے ایک دوسرے سے اس بات پر نہیں لڑ سکتے کہ تم اس رستہ سے کیوں آئے ہو کیونکہ جس کو جو رستہ پسند تھا وہ اس رستہ کے ذریعہ منزلِ مقصود تک پہنچ گیا مگر نقطۂ مرکزی تو ایک ہی ہے ۔ گویا ہر شخص قدرتی طور پر اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے وہ رستہ اختیار کرتا ہے جسے وہ اپنے خیال میں قریب تر اور آسان تر سمجھتا ہے ۔ یا پھر رستے کا واقف بھی ہوتا ہے ۔ لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ رستے کا واقف بھی رستہ پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ جب چلتے چلتے رستہ میں چوراہہ

آجاتا ہے۔ چنانچہ اُسے مجبوراً وہاں ٹھہرنا پڑتا ہے اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ان چاروں راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جائے۔ لہٰذا ایسے بھٹکنے والوں کے لئے حکومت کی طرف سے جو انتظام ہوتا ہے اسے "ٹریفک" کہتے ہیں۔ اور اللہ کی طرف سے جو انتظام ہوتا ہے اسے "عقل" کہتے ہیں۔

بزرگانِ من!

اب تم خود سوچو کر منزلِ مقصود کی طرف کون سا رستہ جائے گا کیونکہ صرف رستہ ہی وجہ اختلاف نہیں ہونا چاہیئے بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ ہماری منزل مقصود کیا ہے۔ ہاں مگر ہر راہرو کو راستے میں کلبات کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ میرا بھائی جو اسی منزل کیطرف جارہا ہے جہاں میں جانا چاہتا ہوں ایسا تو نہیں کہ اس کا رُخ اصل منزل سے بالکل اُلٹ ہو۔ مثلاً میرے بھائی کو لاھور کی طرف جانا ہے مگر وہ بدقسمتی سے کراچی کی سڑک پر چل پڑے اور دوڑنا شروع کردے۔ گویا وہ اپنے راستے پہ جتنا ہی تیز دوڑے گا اتنا ہی اپنی منزل سے دُور ہوتا جائے گا۔ اپنی اس ناسمجھی سے نہ تو کسی سے گلا کرسکتے ہیں اور نہ ہی کسی سے شکوہ کرسکتے ہو۔ نری محنت یا تکلیف اٹھانے سے کام نہیں چلے گا۔ بہرنوع صرف راستہ ہی وجہ اختلاف نہیں ہونا چاہیئے بلکہ دیکھنا یہ ہوگا کہ ہماری "منزل مقصود" کیا ہے۔

یاد رکھو!

ہمارا مقصود ہے "دین" اور ہمارا دین ہے "اسلام" گویا ہم چاہتے ہیں کہ دُنیا میں ہم دیندار بن کے رہیں۔ ایماندار بن کے رہیں۔ کیونکہ وہ آدمی دُنیا میں بڑا ذلیل ہے جو "بے دین" ہو۔ بہت بُرا ہے وہ انسان جو "بے ایمان" ہو۔ اگر کسی کافر کو کافر کہہ دو تو کوئی بُری بات نہیں نہ ہندو کو ہندو کہہ دو تو وہ بُرا نہیں منائے گا۔ اور اگر کسی عیسائی کو عیسائی کہہ دو تو

وہ یہی کہے گا کہ اس میں شک کی کیا بات ہے۔ میں عیسائی ہی ہوں۔ حالانکہ ہندو۔ یہودی اور عیسائی آپ کے خیال میں مومن تو نہیں ہیں ایمان سے ان کا کوئی واسطہ تو نہیں ہے مگر ذرا کسی کو۔ بے ایمان، تو کہدو فوراً بگڑ جائے گا۔ معلوم ہُوا کہ ایمان کوئی ایسی پیاری شے ہے کہ اس سے کوئی علیٰحدہ ہونا برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح بے دین، کہدو تو فوراً بگڑ جائیں گے۔ معلوم ہُوا کہ دین بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے الگ ہونا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔

بچو!

اگر تم ہند میں کسی "بے دین" کو بے دین کہدو تو پتہ چلے گا کہ بے دین نہیں کیا جواب دیتا ہے۔ اسی طرح کسی "بے ایمان" کو بے ایمان تو کہہ دو پھر پتہ چلے گا کہ وہ بے ایمان تمہارے ایمان کی کیا گت بناتا ہے۔ معلوم ہُوا کہ کوئی شخص نہ تو دین سے جُدا ہونا برداشت کرتا ہے اور نہ ہی مذہب سے جُدا ہونا برداشت کرتا ہے۔ گویا دین و ایمان دونوں اتنی پیاری چیزیں ہیں۔

بزرگانِ من!

جب دین و ایمان دونوں، اتنی پیاری چیزیں ہیں تو ہمیں دیکھنا یہ ہے ہمارے بزرگوں نے ہمیں ان کا تعارف کیسے کروایا ہے تاکہ نہ ہم دین کو چھوڑنے پائیں اور نہ ہی اسلام کو چھوڑنے پائیں۔ چنانچہ ہمارے ھادیٔ اعظمؐ نے ہمیں ہزاروں باتیں بتانے کے بعد مجمع عام میں ہمیں کل ایمان کا تعارف بھی کروا دیا اور یہ بتا دیا کہ اس سے علیٰحدہ نہ ہونا ورنہ بے ایمان کہلاؤ گے۔ بہرنوع ھادیٔ اعظم نے ہمیں ایمان کا تعارف کروایا اور ہم صاحبِ ایمان ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ہماری نسل ہندوستان میں پہنچی۔ ہم نے ایمان کو مضبوطی سے پکڑے رکھا مگر یہاں کے لوگ ہمیں بے دین کہنے لگے۔ آخر ہم نے گھبرا

کے پوچھا۔

خداوندا! تو ہی بتا کہ، دین کیا شے ہے جو ہمارے دلوں میں نہیں ہے۔

چنانچہ اللہ نے ہمیں ایک رہبر دے دیا جنہوں نے ہمیں بتا دیا اگر دین پوچھنا چاہتے ہو تو سُنو

"دین است حسینؑ"

گویا رسولؐ نے باپ کو ایمان بنا دیا اور خواجہ معین الدین نے بیٹے کو دین بنا دیا۔ لہٰذا اب اگر کوئی باپ کو چھوڑ دے گا تو بے ایمان کہلائے گا۔ اور اگر کوئی بیٹے کو چھوڑ دے گا تو بے دین کہلائے گا۔ بہر حال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل گفتگو تو یہی ہے کہ وہ دین جس کا تعارف اللہ نے ہادیٔ اعظم کی زبان سے کروایا ہے "اسلام" ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام

"اللہ کو جو دین پسند ہے وہ اسلام ہے"

سامعین!

اگرچہ مجھے اللہ کی پسند میں شک ہے کیونکہ پسند کا تعلق دل سے ہے اور جس کے دل و دماغ ہی نہ ہوں وہ پسند کیا کرے گا۔ اور نہ پسند کرے گا۔ یہ تو ہمیں سمجھانے کے لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کو فلاں شے پسند ہے حالانکہ اللہ جانے۔ اللہ کے پاس کون ایسے لوگ ہیں جن کا دل و دماغ ایسی چیز پسند کرتا ہے۔ ورنہ اللہ تو براہ راست اپنے دل و دماغ سے کوئی کام لیتا ہی نہیں بہر کیف اللہ نے فرمایا کہ میرا پسندیدہ دین ہے "اسلام" ادھر ہم نے اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑا اور جب اسلام کے معنیٰ دیکھے تو پتہ چلا کہ اسلام

مطلب ہے "سر جھکا دینا" یا کسی بات کو "مان لینا" گویا مسلم اسے کہتے ہیں جو
سی بات کو مان لے ۔ اب اگر کوئی شخص کسی بُت کو مان لے تو وہ بت کا مُسلم
ئے گا ۔ اور اگر کوئی سورج یا چاند وغیرہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرے تو وہ انکا
سلم کہلائے گا غرض جو جسے مان لے وہ اس کا مسلم کہلائے گا ۔

نوجوانو!

میں دیکھ رہا ہوں کہ تم مجھے گھور
رہے ہو۔ گویا تمہارا مطلب یہ ہے کہ۔

"زیدی صاحب! ہوش کی بات کرو۔ منبر پہ
بیٹھ کر "بے ہوشی" کی باتیں کرنا گویا منبر کی
توہین ہے ۔ چونکہ سامعین میں تمام تمہارے
جیسے سفید ریش بوڑھے ہی تو نہیں ہیں کچھ
سمجھدار "نوجوان" بھی ہوتے ہیں لہٰذا ان
جوانوں کا بھی خیال رکھا کرو۔ اور سوچ سمجھ
کے بات کیا کرو"

میں کہتا ہوں "نوجوانو!

اگر میں بے ہوشی کی باتیں کروں تو اس میں
میرا کیا قصور ہے ۔ تم نے خود ہی ایک بڈھے
کو منبر پہ بٹھا دیا اور ساتھ یہ بھی توقع رکھتے
ہو کہ "ہوش" کی باتیں کروں ۔ یہ کیسے
ممکن ہو سکتا ہے!

نوجوان جواب میں کہتے ہیں۔ "زیدی صاحب! بھلا یہ

کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک انسان نے بحیثیت انسان کے، بحیثیت آدمؑ کا بیٹا ہونے کے جو شکل و صورت میں بھی انسان ہو۔ دل و دماغ میں بھی ٹھیک ہو۔ اسکے باوجود کسی پتھر کو خدا مانتا ہو۔ انسان سے اتنی حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی"

میں کہتا ہوں "نوجوانو! تمہیں کیا معلوم کہ انسان جہاں چشم فلک کی پلکوں کو چھونا چاہتا ہے وہاں اس میں یہ پستی بھی موجود ہے کہ وہ پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا ہے۔

دیکھو نا!

اگر تمہیں میری اس بات کا یقین نہ آئے تو ہمسایہ ملک (بھارت) میں جا کر دیکھ لو جہاں پچاس کروڑ پوجنے والوں کے پاس پچھتر کروڑ خدا ہیں۔ گویا ایک بندے کے حصہ میں "ڈیڑھ خدا" آتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ہر انسان نے اپنا الگ خدا بنایا ہوا ہے۔ غیر کے خدا کی پوجا کرنا توہین سمجھتے ہیں۔ اپنے خدا کو روزانہ اشنان کراتے ہیں۔ اس پہ بھینٹ چڑھاتے ہیں

مگر خدا صاحب ہیں کہ بڑے آرام سے بُت بنے بیٹھے ہیں کیا مجال جو سردی گرمی کا ان پہ کوئی اثر ہو جائے۔

بچّو!

ہندوستان میں ایک "ہندو خاندان" آباد ہے چونکہ "خاندانِ مغلیہ" کے تمام "نہری" نظام کا انتظام اس خاندان کے سُپرد تھا اس لئے شاہانِ مغلیہ کی طرف سے اس خاندان کو "نہرو" کا خطاب دیا گیا۔ ہندوستان کے خاندانوں میں یہ خاندان اپنی قابلیت کی بنا پر نہایت قابل ترین خاندان ہے تقریباً تیس ۳۰ سال سے یہ خاندان ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے ہندوستان کی موجودہ حکمران (اندرا) اسی خاندان کی ایک فرد ہے ہم نے لاکھ طعنے دیئے مگر "زنانی" وہ کھیل کھیلے رہی ہے کہ "ساٹھ کروڑ" عوام پر حکومت کر رہی ہے گویا ہندوستانی تاریخ میں نہرو خاندان اکثر اوقات مسند حکومت پر رہا ہے اس خاندان کی عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ حکومت کرتی رہی ہیں بھارت میں تو اس خاندان کی یہ حالت ہے مگر

غیر ممالک میں یہ حیثیت ہے کہ جب کبھی
ریڈیو پہ تقریر کرے تو دنیا بھر کے انسان
اپنے ریڈیو کھول کر ان کی تقریر سننا شروع
کر دیتے ہیں اخباری رپورٹرز اس پہ لوٹ
لگتے ہیں۔ چاہے بے عقلی کی بات کہیں
لیکن پھر بھی دنیا ان کی تقریر محفوظ کرنے کی
فکر میں ہے اور ان کے مُنہ سے نکلے ہوئے
لفظ قوموں کیلئے "اقوال زریں" بن جاتے
ہیں۔ گویا نہرو خاندان اتنا عقلمند خاندان
مانا جاتا ہے اور اسمبلیوں میں ان کی عقل
کے پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ لیکن جب گھر میں
تشریف لاتے ہیں تو پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑ
کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یا تو عقل کی اتنی بلندی
کہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے فقروں کو سنہری
لفظوں میں آویزاں کیا جا رہا ہے یا پھر عقل
کی اتنی پستی کہ انسان ہوتے ہوئے پتھر نامراد
کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں۔

آخر ہم پوچھتے ہیں، "پنڈت جی! اسمبلی میں تو اتنی عقلمندی
کی باتیں مگر گھر میں اتنی ناسمجھی کہ پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے
ہو اور اسے "خدا" سمجھتے ہو۔

پنڈت جی کہتے ہیں نادانو! ہماری عقل تو ٹھیک ہے مگر تمہاری سمجھ پہ پردہ

پڑا ہوا ہے۔ جو خواہ مخواہ ہم پہ اعتراض کر رہے ہو"

ہم نے کہا "پنڈت جی!

اعتراض ہی کی تو بات ہے۔ تم اتنے قابل ہو کر پتھر نامراد کو خدا سمجھتے ہو۔ بھلا پتھر بھی پوجنے کے قابل ہوتا ہے"؟۔

پنڈت جی کہتے ہیں۔ "تمہیں کس مسخرے نے بہکا دیا ہے کہ ہم پتھر کو پوجتے ہیں؟"

ہم نے کہا "پنڈت جی!

اس میں بہکانے کی کیا بات ہے۔ یہ تو سامنے کی بات ہے۔ میں خود دیکھ رہا ہوں کہ تم باہوش وحواس پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہو۔ آخر کیوں؟

پنڈت جی کہتے ہیں۔ "دیکھو! اس بات میں دخل نہ دیا کرو۔ کون کہتا ہے کہ ہم اس پتھر کو پوجتے ہیں"

ہم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

پنڈت جی! شرم کرو۔ دن دھاڑے مکر رہے ہو۔ ہاتھ جوڑے سر جھکائے پتھر کے سامنے کیا ہو رہا ہے"

پنڈت جی کہتے ہیں۔ برخوردار!

میں اس پتھر کو نہیں پوج رہا ہوں۔ بلکہ میں تو اپنے سرکش ایمان (قادر المطلق) کو پوجتا ہوں پرادنت کشور (خالق الکل) کو پوجتا ہوں، پرادنت (الصا د) کو پوجتا ہوں۔ اوم (وحدہٗ لاشریک) کو پوجتا ہوں۔ ہم تو نہیں پوج رہے ہیں پھر

کیوں خواہمخواہ ہم پہ پتھر کا الزام لگایا جا رہا ہے "؟

ہم نے پوچھا "پنڈت جی! اگر یہ پوجا نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

پنڈت جی کہتے ہیں "جسے ہم پوج رہے تھے وہ ہمارا مالک ہے، چونکہ مالک کے سامنے گناہگار ہو کر جاتے ہوئے کچھ شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم نے اس پتھر کو اپنے اور مالک کے درمیان وسیلہ بنا کر رکھا ہوا ہے"

ہم نے پوچھا: "پنڈت جی!

دُنیا میں اور بہت سی ایسی چیزیں تھیں جنکو وسیلہ بنایا جا سکتا تھا۔ آخر اس "پتھر" میں کیا خصوصیت ہے۔؟"

پنڈت جی کہتے ہیں۔ "برخوردار!"

تمہاری نظر میں یہ پتھر سہی مگر ہمارے نزدیک یہ بے گناہ ہے اس لئے اسے وسیلہ بنایا ہے"

سامعین!

پنڈت جی کی یہ بات سن کر میں بھی قائل ہو گیا کہ گناہگار کو وسیلہ بنانے سے تو پتھر کو ہی پوجنا بہتر ہے۔ کم از کم اس میں کوئی عقل و شعور کی بات تو ہے؟

بچو: ایک مثال سناتا ہوں۔ اگر پسند آئے تو یاد رکھنا۔

ضلع جھنگ کے ایک گاؤں کا ایک دس نمبری بدمعاش تھانے میں بلوایا گیا۔ جو اپنے ساتھ ایک

سفارشی بھی لے آیا جو اتفاق سے وہ صاحب کسی
فوجداری مقدمے میں مطلوب تھے۔ چنانچہ
جب وہ سفارشی تھانے میں تشریف لائے تو
سفارش کرنے سے پہلے پولیس نے ان کی پٹائی
شروع کردی۔ ساتھی نے پوچھا۔
۔ تھانیدار صاحب! کیوں اس بیچارے کی
پٹائی کر رہے ہو؟"
تھانیدار نے کہا۔
۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ حضرت متواتر چالیس
برس تک ڈاکہ ڈالتے رہے ہیں۔ بھلا ایسے
سفارشی کو تم کیوں ساتھ لائے جو پہلے ہی
کئی مقدموں میں مطلوب تھا؟
بہر نوع سفارشی کا بے عیب ہونا ضروری ہے۔ خواہ تھرڈ ہی
کیوں نہ ہو۔

سامعین کرام!

خدا کا ہم پر بہت بڑا فضل و کرم ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں۔ دوسری باتوں کے
علاوہ ہم اپنے خوراک ولباس کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں حلال کھاتے ہیں اور
حرام سے بچتے ہیں۔ یوں تو مسلمانوں کی اور بہت سی خوراک ہے۔ مگر سب سے
پسندیدہ خوراک گوشت ہے۔ چاہے بکرے کا ہو۔ چاہے گائے کا
ہو۔ چاہے کسی اور بلا کا ہو۔ مگر کھاتے گوشت ہی ہیں چنانچہ پاکستان
کے ہر شہر میں روزانہ تقریباً ہزاروں کی تعداد میں بکرے وغیرہ ذبح کئے جاتے

ہیں۔ تاکہ ہماری خوراک کا تقاضہ پورا ہو۔ لہٰذا ہم روزانہ قصائی کے پاس جاتے ہیں۔ اس کی پسند کی رقم اسے دی جاتی ہے اور اپنی پسند کا گوشت حاصل کیا جاتا ہے (اگرچہ آج کل گوشت بھی قصائی ہی کی پسند کا ملتا ہے)

بہر نوع گوشت خریدا جاتا ہے اور کبھی بھی قصائی سے یہ نہ پوچھا کہ جس بکرے کا گوشت تو مجھے دے رہا ہے اس کا سینگ ٹھیک تھا یا نہیں۔ کان ٹھیک تھے یا نہیں۔ کہیں اندھا تو نہیں تھا۔ کہیں لنگڑا تو نہیں تھا؟ ہرگز نہیں اگر بکرا اندھا یا لنگڑا تھا تو ہمیں کیا واسطہ، ہمیں تو گوشت سے سروکار ہے۔ گویا ہم تین سو چونسٹھ دن تک تو عیب دار بکرے کھا لیتے ہیں مگر جب تین سو پینسٹھواں (عید الضحیٰ) آتا ہے تو بڑا خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں بکرا عیب دار نہ ہو۔ سینگ ٹوٹا ہوا نہ ہو۔ اندھا نہ ہو۔ لنگڑا نہ ہو گویا بکرے میں کسی قسم کا کوئی عیب نہ ہو۔ آخر ہم اپنے محلے کے مولوی صاحب سے پوچھتے ہیں۔

مولانا! کیا اس سے پہلے سال بھر آپ عیب دار بکرے کا گوشت نہیں کھاتے رہے جو آج اتنی احتیاط برتی جا رہی ہے؟

مولانا فرماتے ہیں۔

"برخوردار! تین سو چونسٹھ دن میں ذبح ہونے والے بکروں کی اور بات ہے اور آج (عید الضحیٰ) کے دن ذبح ہونیوالے بکرے کی اور شان ہے۔

ہم نے پوچھا۔ مولانا! آج کے بکرے میں کیا خصوصیت ہے؟"

مولانا فرماتے ہیں۔

"برخوردار! چونکہ آج کے دن کا بکرا ہم گناہگاروں

کا وسیلہ بن کر ذبح ہو گا۔ اس لئے احتیاطاً اس بات
کی کی جاتی ہے کہ وسیلہ بے عیب ہو؟

صاحبانِ ذوق!

یہاں تو میں بھی قائل ہو گیا کہ اگر بکرے کو بھی وسیلہ بنا لیا
جائے تو بے عیب ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جب تک وسیلہ بے عیب
نہیں ہو گا۔ اس وقت تک کسی گناہ گار کی بخشش نہیں ہو سکتی۔

عزیز بچو! اس دفعہ تو میں بھی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا بحیثیت
مولوی ہونے کے میں بھی سال میں ایک بکرا ذبح کر بیٹھتا ہوں حالانکہ بقول مولوی
صاحب یہ بدعت ہے مگر کیا کروں اس کے بغیر گذارا بھی نہیں ہوتا۔ گذشتہ
سال کی طرح اس سال بھی محلے والوں کی شرم کی وجہ سے مجھے بھی بکرا ذبح کرنا پڑا
حالانکہ بکروں کا عالم یہ تھا کہ جس بکرے کو دیکھتا وہی منہ بنا کر کھڑا ہو جاتا۔ گویا
اتنی مہنگائی تھی۔ بالآخر مجبوراً ایک عمدہ سا بکرا خریدنا پڑا جس کے سینگ بہترین،
کان بہترین۔ خوب موٹا تازہ پلا پلایا پہلے تو اسے پورے محلہ میں گھمایا تاکہ پڑوسی بھی
دیکھ لیں کہ مولوی صاحب نے بکرا خرید کیا ہے۔ رات کو گھر سے باہر باندھا۔
چارہ قریب تک نہ آنے دیا کیونکہ بھوکا رہنے سے رات بھر بولے گا تو وہ پڑوسی
جو دن کو نہ دیکھ سکے ہوں، رات کو اس کی آواز سن لیں تاکہ میری قربانی کا
ان پر بھی رُعب پڑ جائے۔ بہر طور دن چڑھے قربانی کا وقت آ گیا۔
جب قصائی بکرا ذبح کرنے کے لئے اپنی آستین چڑھانے لگا تو اچانک وہ
حضرت تشریف لائے جن سے بکرا خریدا گیا تھا۔ وہ آتے ہی چلانے لگے۔
"زیدی صاحب! غضب ہو گیا۔ خدارا اس بکرے کو ذبح نہ کیجئے گا"
میں نے پوچھا "کیوں۔ کیا بات ہے؟"

اُس نے کہا۔ زیدی صاحب ! یہ بکرا ہے تو بہت ہی عمدہ۔ بظاہر اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ گھر کا پلا ہُوا ہے۔ مگر جس دن یہ میرے گھر میں پیدا ہُوا تھا اس کی ماں مر گئی تھی لہٰذا میں نے اپنی کُتیا کا دُودھ پلا کر اسے پروان چڑھایا ہے۔"

سامعین!

بکرے والے کی یہ بات سن کر میرے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا اور پورا بدن غصّہ سے کانپنے لگا اور گھبرا کر مُسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے مولوی سے جا کر پوچھا مگر ہر ایک نے یہی جواب دیا کہ اس بکرے کا ذبح کرنا حرام ہے کیونکہ یہ تو بہت ہی عیب دار ہے۔

میں نے عرض کی " مولانا ! عیب دار ہو گا مگر اب تو بہترین عمدہ اور اچھا تندرست ہے "

میری یہ بات سنکر مذاہب اسلام کے تمام مولوی صاحبان کا متفقہ فیصلہ یہ ہُوا کہ ہم آج کے بے عیب ہونے کو کیا کریں اسکی تو ابتدا ہی نجاست میں گزری ہے۔ لہٰذا جس کی ابتدا نجاست میں گذری ہو اسے وسیلہ نہیں بنایا جا سکتا چاہے بکرا ہی کیوں نہ ہو۔

بزرگانِ من!

میں عرض کر رہا تھا کہ ہر انسان اپنے معبود کا مسلم ہوتا ہے اور ہر پوجنے والا اپنی پوجا کا مسلم ہوتا ہے۔ ہر انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ جس کو چاہے مان لے چاہے وہ اللہ ہو یا قادرِ مطلق ہو۔ پیدا کرنے والا ہو یا مارنے والا ہو۔ حتیٰ کہ سانپ ہو یا بچھو ہو گائے ہو یا گنگا ہو۔

غرض انسان اپنی عقل کے مطابق کسی نہ کسی شے کا مسلم ضرور ہوتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ انسان جس کو مان رہا ہے وہ بھی اسے مانتا ہے یا نہیں بہر نوع ہر انسان کسی نہ کسی کا مسلم ضرور ہوتا ہے ۔

کیوں نوجوانو! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟

دیکھو!

تم سے اس لئے پوچھتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھے ہوئے ہو اور صحابیوں کو اپنی ہر بات کا راوی رکھنا چاہئے ۔

یاد رکھو!

پتھر کو پوجنے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انسان کو ٹوکنے والے سے نفرت ہوتی ہے اور نہ ٹوکنے والے سے محبت ہوتی ہے ۔ گویا انسان فطری طور پر ٹوکنے والے کو ناپسند کرتا ہے اور نہ ٹوکنے والے کو پسند کرتا ہے لہٰذا انسان نے سوچا کہ اگر اللہ کو مان لیا جائے تو وہ ہر قدم پر ٹوکتا ہے ۔ کہ تم جھوٹ کیوں بولتے ہو ۔ کسی کو ستاتے کیوں ہو ۔ کسی کا مال کھاتے کیوں ہو ۔ گویا اللہ رات دن ٹوک ٹوک کر انسان کا ناطقہ بند کر دیتا ہے ۔ لہٰذا انسان نے چاہا کہ ٹوکنے والے اللہ کو چھوڑو اور خود ایسے اللہ بناؤ جو ٹوکتے نہ ہوں ۔ پوجو تو واہ واہ نہیں کہتے اور توڑ دو تو بُرا نہیں مناتے اور چونکہ انہیں پتہ ہے کہ ہم انسان کے بنائے ہوئے ہیں ۔ لہٰذا اگر انسان کی مرضی کے خلاف کچھ کہیں گے تو یہ ہمیں توڑ بھی دے گا ۔ اس لئے یہ بہت شریف بھلے مانس بنے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں ۔ اگر انہیں گھر میں رکھ دو تو خاموش بیٹھے رہیں گے بازار میں لے آؤ تو چپ رہیں گے ۔ مسجد میں رکھ دو تو بت بنے بیٹھے رہیں گے اور اگر اللہ کے گھر میں لا کے رکھ دو تو

پتھرائی نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے ضرور رہیں گے کہ اللہ جانے اسکے بعد کیا حشر ہو گا مگر منہ سے کچھ نہیں کہیں گے۔ بہر نوع انسان نے ایسے خاموش اور بے حس و حرکت اللہ بنا لئے۔

بچو!

ایک دن عالم تصور میں میں انسان کے بنائے ہوئے ان خداؤں سے پوچھ رہا تھا جو اللہ کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"انسان کے بنائے ہوئے خداؤ، بتاؤ۔ کیا تم خدا بن گئے ہو؟"

بتوں نے جواب دیا۔ مولانا!

ہم خود ہی تھوڑے آئے ہیں۔ انسان نے ہمیں بٹھا دیا۔ ہم بیٹھ گئے اور جس دن نکال دے گا، چلے جائیں گے۔ ہماری ضد تھوڑی ہے۔ یہ تو بنانے والے کی مرضی پہ منحصر ہے۔ کہ بنا دے یا توڑ دے؟

بہر نوع انسان نے اپنی فطری تقاضہ کے تحت نہ ٹوکنے والے کو خدا بنالیا اور ٹوکنے والے سے دور رہنے لگا۔

نوجوانو! یاد رکھو!!

جس انسان کی دس بیس نسلیں نہ ٹوکنے والے خدا کی صحبت میں گذر چکی ہوں تو اس کے رگ و ریشہ میں یہ بات سرایت کر جاتی ہے کہ وہ نہ ٹوکنے والے کو پسند کرتا ہے اور ٹوکنے والے کو ناپسند کرتا ہے گویا بت پرستی کی عادت یہ کہلوا دیتی ہے کہ۔

"ہمیں نہ ٹوکنے والی کافی ہے"

بہرنوع انسانی فطرت ہے کہ وہ نہ ٹوٹنے والی چیز کو پسند کرتا ہے اور ٹوٹنے والی شے سے نفرت کرتا ہے۔

اور یاد رکھو!

آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے کہ انسان ہر ٹوٹنے والی شے کو نہیں چاہتا اور نہ ٹوٹنے والی شے کو چاہتا ہے۔ جس طرح ہماری اسمبلی میں چند دن پیشتر ایک صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ ہم جو کہتے تھے کہ ہماری حکومت عوام پر دُور ہے غریبوں پہ رحم کرنیوالی ہے۔ مگر ہم نے غریبوں کو بہت ستایا ہُوا ہے کہ ٹریفک کا ایک سپاہی جو ہماری طرح کا ایک انسان ہے۔ ہماری طرح کا گوشت پوست کا بنا ہوا ہے جسے ہماری حکومت صرف سو ڈیڑھ سو روپیہ دیتی ہے۔ وہ بے چارہ گرمی سردی اور برسات میں چوراہے پہ کھڑا ہے۔ اشارے کر کر کے اس کے ہاتھ تھک جاتے ہیں۔ کبھی دائیں گھوم رہا ہے۔ کبھی بائیں۔ گھوم رہا ہے اور تین چار گھنٹے متواتر اسے اس عالم میں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ اسپیکر نے پوچھا آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

ممبر نے عرض کی۔ حضور! میرا مطلب یہ ہے کہ اس سپاہی کو چوراہے سے ہٹا دیا جائے اور اسکی جگہ پتھر کی ایک میز رکھ دی جائے اور اس میز پر ٹریفک کے قوانین کی ایک "کتاب" رکھ دی جائے تاکہ ہر گزرنے والا خود ہی کتاب پڑھ لیا کرے۔ کیوں خواہ مخواہ کیلئے سپاہی بے چارے کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ گزرنے والے خود ہی اس

کتاب کو پڑھ لیا کریں گے۔ کیوں کہ صرف "کتاب ہی تو کافی ہے"

سامعین!

ممبر کا یہ کہنا تھا کہ "کتاب کافی ہے" کہ ساری اسمبلی اس کے پیچھے پڑ گئی کہ یہ حضرت جو سپاہی کو ہٹا کر کتاب لانا چاہتے ہیں، ضرور ان کی نیت کوئی جرم کرنے کی ہے۔ بھلا آج کل کی تیز رفتاری کے دور میں چلنے والے کو کہاں فرصت ہے کہ وہ چوراہے پہ ٹھہر کر پہلے ٹریفک کی کتاب پڑھ لے، پھر آگے چلے۔ اور اگر کوئی ٹھہر کر کتاب پڑھ بھی لے گا تو اس کے "معنی" اپنے مقصد کے مطابق ڈھال لے گا۔ چنانچہ جہاں پہ سائیکل والا چاہتا ہو کہ پہلے میں چلا جاؤں۔ تانگے والا چاہتا ہو کہ پہلے میں چلا جاؤں اور گاڑی والا چاہتا ہو کہ پہلے میں چلا جاؤں گویا جہاں ہر ایک پہلا بننا چاہتا ہو وہاں کتاب غریب کو کون پوچھے گا۔

بہر نوع۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر ایک اپنے اپنے قیاس کی بنا پر مسلم ہوتا ہے اور ہر ایک اپنے اپنے خیال میں اپنا اپنا رستہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس میں کوئی جھگڑے کی بات ہے نہ ہی کوئی لڑائی کی بات ہے منزلِ مقصود تو ایک ہی ہے۔ صرف وہاں تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں ان راستوں کو مذہب کہتے ہیں اور منزلِ مقصود کو "دین اسلام" کہتے ہیں

بزرگانِ من!

دین اسلام میں چند باتوں کا اظہار زبان سے کیا جاتا ہے اور

کچھ عمل سے کیا جاتا ہے ۔ صرف زبان سے کہے تو تب بھی اسلام پورا نہیں
ہوتا اور صرف بغیر زبان سے کہے ، تب بھی اسلام پورا نہیں
ہوتا ۔ لہٰذا کچھ کہنا پڑتا ہے اور کچھ کرنا پڑتا ہے ۔

دیکھو نا !

چاہے تم جتنی ہی لمبی بات کہہ دو ۔ مگر یہ اسلام کا اقبال ہے ۔
کہ تمہاری اتنی لمبی چوڑی گفتگو "کلمہ" ہی کہلائے گی جسے ہر شخص پڑھ
کر مسلمان بنتا ہے ۔ اور وہ کلمہ یہ ہے ۔

"لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ ۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ"

یہ گویا دین اسلام کا کلمہ ہے ۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ کلمہ اتنی
روانی سے پڑھا جاتا ہے کہ کہیں بھی کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی
گویا "نکتہ" تک کی رکاوٹ اس کلمہ میں نہیں ہے ۔

یاد رکھو !

کلمہ طیبہ کے چار اجزاء ہیں ۔ لا ۔ اِلٰہ ۔ اِلّا ۔ اللّٰہ
پہلا لفظ کہو "لا" جس کے معنیٰ ہیں "کچھ بھی نہیں"
دوسرا جوڑو ۔ "لا الٰہ" جس کے معنیٰ ہیں "اللہ نہیں ہے" گویا
کفر ہو گیا ۔

تیسرا جوڑو ۔ "لا الٰہ الا" جس کے معنیٰ ہیں "اللہ نہیں ہے مگر"
گویا مہمل ہو گیا اور چوتھا "اللّٰہ" جوڑ دو تو ایمان ہو گیا ۔
لیجئے اب کلمہ مکمل ہو گیا ۔ بہر لحاظ ہمیں کہنا پڑا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک
ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں ۔ یہ کہہ کر ہم مسلمان بن گئے ۔ ہم
صاحبِ ایمان ہو گئے ۔ ہمارے دل میں شمعِ ایمانی روشن ہو گئی ۔

اور ہم دائرہ اسلام میں آگئے۔

بزرگانِ من!

چودہ سو سال سے ہم تو یہی سمجھے ہوئے تھے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے کہنے سے ہمارا کلمہ مکمل ہو جاتا ہے مگر ۶۔ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں پتہ چلا کہ یہ کلمہ پڑھنے کے باوجود اگر اپنے ہاتھ سے بنائے ہوؤں کو مان لیا جائے تو پھر بھی ہم غیر مسلم ہو سکتے ہیں۔ بہر لحاظ اسلام میں ایک کلمہ ہے جسے پڑھنے سے ہم مسلمان ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ اسلام میں ایک عمل ہے جسے اَدائے حق کہا جاتا ہے۔

یاد رکھو!

ادائے حق کے معنی صرف یہی ہیں کہ تم پر اللّٰہ کی طرف سے جو فرائض وحقوق واجب ہیں ان کا حق اَدا کرو۔ مثلاً اگر ماں باپ ہو تو اولاد کا حق ادا کرو۔ اولاد ہو تو والدین کا حق ادا کرو۔ بھائی ہو تو بھائی کا حق ادا کرو۔ بہنوں کا حق ادا کرو۔ ماتحت ہو تو افسر کا حق اَدا کرو۔ اور بندے ہو تو اللّٰہ کا حق اَدا کرو۔ گویا اَدائے حق کو عمل کرتے جیسے اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کرو۔ اور بندے کا حق یہ ہے کہ اگر کہیں لڑکر بندے کا حق ادا کرنا پڑتا ہے تو لڑکر کرو۔ اور اگر کہیں صُلح سے حق ادا کرنا پڑتا ہے تو صلح سے کرو۔ گویا کہیں اَدائے حق کے لیے لڑنا پڑتا ہے اور کہیں اَدائے حق کے لیے صُلح کرنی پڑتی ہے۔

بہر نوع ہر صورت میں جو تم پر فرض ہے ۔ وہ حق اَدا کرو ۔ گویا
کہیں جہاد کر کے حق اَدا کیا جا رہا ہے اور کہیں تلوار
روک کے حق اَدا کیا جا رہا ہے ۔ کہیں تلوار چلا کے
حق ادا کیا جا رہا ہے ۔ اور کہیں تلوار کھا کے حق
اَدا کیا جا رہا ہے ۔ لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ
جس طرح بھی حق اَدا ہوتا ہو، اَدا کرے ۔ بس اسی
اَدائے حق کو عمل کہتے ہیں ۔

سامعین !

مذہب کی بات ہے نہ عقیدت کی بات ہے بلکہ ایک غیر جانبدار
تاریخی مطالعہ کی بات ہے کہ کائنات میں اسلامی حق ادا کرنے کے لئے تین ہی
دو مکاتب فکر ملیں گے اور وہ ہیں علیؑ اور حسینؑ ۔ لہٰذا علیؑ کی
تعلیم کو ضرب کہتے ہیں اور حسینؑ کی تعلیم کو سجدہ کہتے ہیں ۔ بس یہی
دو مکتب فکر ہیں جن سے اسلام میں ادائے حق کی تعلیم ملتی ہے ۔ گویا کہیں
سر پہ ضرب لگا کے حق اَدا کیا جا رہا ہے اور کہیں سر پہ ضرب
کھا کے حق اَدا کیا جا رہا ہے ۔ ان کے علاوہ کسی تیسرے مکتب سے
ایسی تعلیم کا ملنا ناممکن ہے ۔

نوجوانو! یاد رکھو !!

یا علیؑ کہنا ہمارا ایمان ہے ۔ ہمارا دین ہے ۔ ہماری پہچان
ہے ۔ ہماری علامت ہے ۔ جو ہمیں زبردستی غیروں کے ساتھ وابستہ کرنا چاہیں
وہ تو کہہ دیتے ہیں کہ یا علیؑ مدد کہنا ضروری نہیں ہے ۔ حالانکہ یا علیؑ مدد کہنا
تو ہماری دوسروں سے "امتیازی" نشان ہے ۔ مگر یا علیؑ کہتے کہتے بھی سو رُخ ایک [illegible]

کر علیؑ نے اُسے حق میں کیا کیا۔ کہاں تلوار چلا کے حق ادا کیا اور کہاں تلوار کھا کے حق ادا کیا۔ کہیں تو علیؑ کی تلوار خیبر کی چولیں ہلا رہی ہے اور کہیں خندق کو فتح کر رہی ہے۔ کہیں علیؑ کی تلوار اُحد و بدر میں معرکے دکھا رہی ہے اور کہیں علیؑ کی تلوار نیام میں رکھی ہوئی ہے۔ اور اسی تلوار کا مالک خاموشی سے سر جھکائے گردن بندھوائے چلا آ رہا ہے۔ گویا خیبر کے دروازے کو گرانے والا خود اپنے دروازے کو خاموشی سے گرتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ یہ ہے علیؑ کی وہ ادا جس پہ کائنات مرتی ہے۔ دوسروں کے بچوں اور عورتوں پہ رحم کرنے والا جب اپنی عورتوں اور بچوں کو زخمی دیکھتا ہے تو خاموش کھڑا رہتا ہے۔

یاد رکھو!

علیؑ کے علاوہ کسی اور سے ان اخلاقی ضابطوں کا ملنا ناممکن ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ علیؑ نے کتنی سعد و جہد کے بعد خیبر جیسے عظیم قلعہ کا دروازہ توڑ گرا کے فتح کیا ہے۔ حالانکہ علیؑ کو پتہ ہے کہ خیبر کے اندر جس کا میں فاتح ہوں، کروڑوں عربوں روپے کی دولت موجود ہے۔ مگر وہ غیور فاتح خیبر فتح کرنے کے بعد قلعہ کے اندر نہیں جاتا بلکہ خاموش سر جھکائے خیبر کے دروازے پہ کھڑا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی فوج اندر گئی۔ لوٹ مچائی اور جی بھر کے مالِ غنیمت لوٹا۔ چند بزرگوں نے پوچھ لیا۔

• یا علیؑ! تم اندر کیوں نہیں جاتے حالانکہ تم نے

ہی خیبر فتح کیا ہے ؟
علیؑ فرماتے ہیں۔
بھئی ! اس خیال سے اندر نہیں گیا کہ قلعہ کے اندر
خیبر والوں کی عورتیں تھیں لہٰذا مجھے ایسے
گھر میں جاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے جہاں
کسی کا ناموس ہو۔
بزرگانِ من !
اخلاقی تعلیم کی یہ انتہا ہے کہ خیبر کا فاتح خیبر کے اندر جاتے ہوئے
ہچکچا رہا ہے کہ کہیں ان کا کوئی ناموس نہ ہو۔
بتاؤ !
خیبر کا در اکھاڑ لینے سے زیادہ یہ ادا شاندار ہے یا نہیں کہ خیبر کا فاتح
سر جھکائے دروازے پہ کھڑا ہے اور دوسرے مسلمان مالِ غنیمت لوٹ رہے
ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں ”یا علیؑ ! جانے سے ڈرتے ہو ؟“
علیؑ مسکرا کر فرماتے ہیں ”دیکھو ! جان کی مجھے کوئی فکر
نہیں ہے۔ کیونکہ جان تو اللہ کی دی ہوئی ہے۔ جب چاہے
گا لے لیگا۔ مگر آن پہ حرف نہیں آنے دینا تاکہ کوئی یہ نہ کہہ دے
کہ محمدؐ کا بھائی، محمدؐ کی زبان چوس کر پلنے والا
محمدؐ کے سینے پہ کھیلنے والا دوسرے کے زنانے
گھر میں چلا گیا“
حضور والا !
علیؑ کی یہ اخلاقی ضرب ہے جو اس نے خیبر میں لگائی تھی اور علیؑ

کی شجاعت کی یہ اُدا اس کے بچّوں کو ورثہ میں مل گئی مگر بچوں نے بھی آن پر جان قربان کر دی!

بتاؤ!

آن پر جان دینے کی اس سے عمدہ مثال کائنات میں کہاں مل سکتی ہے کہ ماں نے اپنے بیٹوں کا بازو پکڑا ہوا ہے۔ دروازے پہ کھڑی ہے اور سامنے دشمن کی فوجوں کا ٹھاٹھیں مارتا لشکر ہے اور ماں اپنے بچوں سے کہہ رہی ہے۔

"بچّو! میدانِ جہاد میں جاؤ۔ شہادت مُبارک ہو مگر یاد رکھو! دشمن کی فوجوں کا جُھرمٹ دیکھ کر ڈگمگا نہ جانا بلکہ ثابت قدم رہنا۔ تم اپنی زبان سے کچھ نہ کہنا۔ میں تو جب دُودھ بخشوں گی جب فوجیں چلّا اُٹھیں کہ تم علیؑ کے نواسے ہو۔ جعفرؑ طیار کے پوتے ہو"

یہ سنکر بچّوں نے ماں کے قدم چُوم کر قسم کھائی

"امّاں! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ انشاء اللہ ہم ثابت کر دیں گے کہ ہم نے زینبؑ کا دُودھ پیا ہے"

تاریخ عالم نے یہ منظر دیکھا کہ تھوڑی دیر بعد پچاس ہزار فوج ان دو معصوم بچوں کو گرا کر خوشیاں منا رہی ہے۔ گویا انسانی بے حیائی کی یہ حد ہے کہ تین دن کے بھوکے پیاسے بچوں کو گھوڑے سے گرا کر پچاس ہزار فوج خوشیوں کے باجے بجا رہی ہے۔ باجوں

کی آواز سُن کر خیموں میں کھڑی مستورات سمجھ گئیں کہ زینبؑ کے بچے گر گئے۔
بے ساختہ مستورات کے منہ سے نکلا۔

"ہائے! زینبؑ کے بچے گر گئے"

زینبؑ فرماتی ہیں:" بیبیو! ہائے نہ کہو۔ خدارا کسی کی آنکھ سے آنسو نہ نکلنے پائے۔ دیکھتی نہیں ہو کہ باجوں کے ساتھ میرے بچوں کی بارات آرہی ہے"

تھوڑی دیر بعد بچوں کے لاشے بیت الشرف میں لائے گئے۔ زینبؑ دروازے میں کھڑی لاشوں کو تکتی رہی۔ آخر امامؑ نے فرمایا:-

زینبؑ! دیکھو۔ تمہارے بیٹوں کے لاشے ہیں ذرا ان کے پاس آجاؤ۔ یہ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں"

زینبؑ آگے بڑھی۔ بچوں کے قریب آئی۔ آخر ماں تھی، دل بھر آیا۔ بڑا بچہ تو ختم ہو چکا تھا۔ چھوٹے میں ذرا دم تھا۔ ماں نے بیٹے کے منہ کے قریب کان لگا دیئے۔ کانپتے ہونٹوں سے ایڑیاں رگڑتے ہوئے بچہ یہ کہہ رہا تھا

"اماں! اَب تو مطمئن ہونا۔ ہم نے آپ کے دودھ کی آبرو رکھ لی"

زینبؑ جواب میں فرماتی ہیں۔

"بیٹو! مجھے گمان نہیں تھا کہ تم اتنے باعزت ہو۔ میرے لعل! اگر جھڑکا ہو تو مجھے معاف کر دینا۔

عزاء دار سید الشہدا !

یہ تو زینبؑ کی قربانی ہے جو علیؑ کی بیٹی ہے۔ جس نے فاطمہؑ کا دودھ پیا ہے۔ مگر غیر خاندان کو دیکھو جو سیدانی نہیں ہے بلکہ اُمتی ہے جس کا جوان بیٹا ہے۔ اب ذرا اٹھارہ سالہ بیٹے کی ماں کے دل سے پوچھو کہ اس کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ جوان بیٹے کی لاش خیمے میں آئی ہوئی ہے۔ تمام سیدانیاں اکبرؑ کے لاشے پہ کھڑی رو رہی ہیں مگر لیلیٰؑ اپنے خیمے میں ہے۔

اکبرؑ نے پوچھا۔

" بابا جان ! میرا آخری وقت ہے میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں "

اکبرؑ کی یہ بات سنکر زینبؑ خیمے میں آئی دیکھا کہ لیلیٰ کبھی داہنی قنات کے ساتھ سہارا لیتی ہے اور کبھی بائیں قنات کے ساتھ اسی عالم گھبراہٹ میں خیمے میں پھر رہی ہے۔ بھاوجہ کی یہ کیفیت دیکھ کر زینبؑ فرماتی ہیں۔

" لیلیٰ ! اِدھر آؤ۔ اکبرؑ یاد کر رہا ہے "

لیلیٰؑ جواب میں فرماتی ہیں: " فاطمہؑ کی بیٹی ! میری بینائی ختم ہو چکی ہے اور مجھے خیمے کا پردہ نظر نہیں آتا "

زینبؑ نے لیلیٰؑ کا ہاتھ پکڑا۔ اکبرؑ کے لاشہ پہ لائی۔ لیلیٰؑ نے اکبرؑ کے سینے پہ ہاتھ رکھا خون میں تر ہو گیا اور لیلیٰؑ نے وہی خون آلود ہاتھ اپنے سر کے سفید بالوں پہ مل لیا اور فرمایا۔

" اکبرؑ بیٹا ! یہ خون آلود بال تیری دادی کے

سامنے لے جاؤں گی۔ میرے لعل! یہ میرا تحفہ ہے جو میں فاطمہؑ کی خدمت میں پیش کروں گی"

سامعین کرام! یاد رکھو!

جادۂ عقل وعلم کے مطابق ضابطۂ اخلاق کی معراج یہی ہے کہ کہیں ضرب لگا کر حق اُدا کیا جائے اور کہیں ضرب کھا کر حق اُدا کیا جائے۔ کہیں خاموش رہ کر حق اُدا کیا جائے اور کہیں نیزہ پہ سوار قرآن پڑھ کر حق اُدا کیا جائے کہیں جوان بیٹے کے پھسے ہوئے کلیجے سے نیزہ کھینچتے ہوئے مسکرا کر حق اُدا کیا جائے کہیں بڈھے ہاتوں پہ ششماہے کا لاشہ اٹھا کر حق اُدا کیا جائے۔

غرض ہر موقع ومحل کے مطابق اُدائے حق کو ضابطۂ اخلاق کی معراج میں عمل کہتے ہیں جس کی تعلیم صرف علیؑ وحسنینؑ کے مکاتب فکر سے ہمیں مل سکتی ہے۔ چاہے وہ ضرب یداللّٰہی ہو یا سجدۂ شبیریؑ ہو

بزرگو!

سانحہ کربلا کو گذرے آج گیارہ دن ہو چکے ہیں۔ اللہ جانے اہلبیت رسولؐ آج کس عالم میں ہوں گے۔ آج کس بازار سے گذر رہے ہوں گے۔ آج کس کچہری میں کھڑے ہونگے

خدا معلوم! بے کس و مجبور قیدیوں کی گردنوں سے بندھے ہوئے ہاتھ بھی کسی نے کھولیں ہیں یا نہیں۔
خدا جانے! محمدؐ کی بیٹیاں آج کس بازار میں پھرائی جا رہی ہوں گی۔ اللہ جانے! علیؑ کی بیٹیوں پہ آج کیا گذر رہی ہو گی۔
خداوند عالم بصدقہ محمدؐ و آل محمدؐ ہماری مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے اور عزاداری سید الشہداءؑ کی حفاظت فرمائے اور اس عزاداری کو عزت و احترام کے ساتھ باقی رکھے۔

دنیا والو!
ہم تم سے ہنسنے کا حق نہیں مانگتے بلکہ ہم صرف رونے کا حق چاہتے ہیں۔ دنیا کی تمام خوشیاں تمہیں نصیب ہوں، مگر ہمارا رونا ہمیں دے دو خدارا! ہمارے آنسوؤں پہ پابندی نہ لگاؤ

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَنَا نَاصِرُ یَا رَسُولَ اللّٰہ

خداوند عزاسمہٗ وجل جلالہٗ کی حمد و ثناء کے بعد حضرت محمد و آلِ محمد پر درود و سلام

حضراتِ گرامی قدر!

اللہ نے اپنے رسولؐ کو جب اعلان رسالت کا حکم دیا تو فرمایا کہ عوام کو منہ نہ لگاؤ اور نہ ہی پبلک سے ابھی گفتگو کرو۔ بلکہ سب سے پہلے اپنے "اقربین" سے بات کرو۔ گویا رسولؐ کے گرد پہلا اجتماع جو ہوا وہ "اقربین" تھے۔

سامعین کرام!

علم تاریخ کے عام مفسرین، مبصروں اور محققین سے آج میں یہ پوچھتا ہوں کہ بتاؤ اس آیت کی تعمیل میں رسولؐ نے جو "اقربین" اکھٹے کئے تھے ان کی فہرست کیا ہے۔؟ چنانچہ مورخین نے ہم تک جو فہرست پہنچائی ہے ان میں صرف اولاد عبد المطلب کے مرد اور خواتین جمع تھے۔ ان کے علاوہ نہ ہی خدیجۃ الکبریٰؑ ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی عزیز اس دعوت میں موجود تھا۔ گویا خدیجۃ الکبریٰؑ کا نہ ہونا اور اولاد عبد المطلب کا ہونا ہی یہ واضح کر گیا کہ رسولؐ کے اقرب کون ہیں۔ خدیجہؑ جتنی ہی محترم بیوی سہی مگر اقربین میں سے نہیں ہیں۔

یاد رکھو!

اب اگر ہم "اقربین" کی مودّت فرض کریں گے تو بیوی کے رشتے کو سامنے نہیں لانا ہوگا۔ گویا آج ہی سمجھ لو کہ اقربین کون ہیں۔

بہر نوع ! اقربین جمع تھے جن میں خواتین بھی تھیں اور مرد بھی تھے مردوں میں حضرت ابو لہب بھی تھے، حضرت ابو جہل بھی تھے، حضرت عتیبہ بھی تھے، حضرت شعبہ بھی تھے "آخر اقرب تھے۔ یہ اور بات ہے کہ "ع "ہے" عقرب" تھے مگر سب اقرب تھے۔ اِدھر قنات کے پیچھے خواتین بھی بیٹھی تھیں جن میں حضرت صفیہ بنت عبداللہ، فاطمہ بنت اسد۔ اُمِّ ھانی بنتِ ابی طالب اور چھ مہینے کی بچی فاطمہؑ بنتِ محمدؐ بھی تھیں۔

خدا گواہ ہے۔

میں نے خوب غور سے دیکھا۔ ایک ایک لفظ کو ٹٹول ٹٹول کے پڑھا عینکیں لگا لگا کے دیکھا مگر یہی دیکھا کہ اقربین کی اس دعوت میں محمدؐ کی چھ مہینے والی بیٹی تو ہے مگر اس کی بڑی بہنوں کا نام کہیں نہیں ملا۔ گویا آج نہیں ہیں تو آئندہ بھی نہیں ہیں۔ بہر نوع ان اقربین سے رسُولؐ نے خطاب کیا۔

" اے میرے اقربین ! تم میں سے کون میرا ساتھ دینا چاہتا ہے۔ دیکھو! میں غیر کا احسان نہیں اٹھانا چاہتا اس لئے اپنوں سے گفتگو کر رہا ہوں "

صاحبانِ ذوق !

جب رسُولؐ نے یہ فرمایا کہ کون ہے جو میرا ساتھ دے گا تو بڑے بڑے بزرگ خاموش ہو گئے اور ایک کونے سے دس گیارہ سال کا بچہ ایڑھیوں پر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں کہنے لگا۔

" اَنَا نَاصِرُ یَا رسُولَ اللّٰہ "

" اے اللہ کے رسول ! میں آپ کا ساتھ دوں گا "

یاد رکھو!

اگر بچہ اس وقت یہ کہہ دیتا " اے محمدؐ! میں آپ کا ساتھ دونگا" تو یہ ساتھ صرف محمدؐ کی زندگی تک کا تھا۔ مگر بچے نے یا رسول اللہ کہکر اس بات کا عہد کرلیا کہ جب تک تیری رسالت ہے اس وقت تک میری نصرت تیرے ساتھ ہے!

بہر نوع! بچے نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا تو رسول نے بڑھ کر سینے سے لگالیا۔ پیار کیا اور فرمایا " بیٹا! تو نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے ____ لھٰذا

اَنْتَ وَصِیُّ " تو میرا وصی ہے"

اَنْتَ وَزِیْرِ " تو میرا وزیر ہے۔ اور

اَنْتَ خلیفۃ من بعدہٖ " میرے بعد میرے مشن کا انچارج بھی تو ہی ہے"

رسولؐ نے یہ وعدہ فرمالیا اور بچہ سُن سے خاموش ہوگیا۔ گویا معاہدہ ہوگیا اور اس معاہدہ کے دو فریق ہیں۔ ایک طرف گیارہ سالہ بچہ ہے اور ایک طرف تنتالیس سالہ رسولؐ ہے۔

سامعین!

اب بتاؤ۔ معاہدہ سے پھر جانے کا احتمال کس طرف سے ہے؟

ممکن ہے کہ بچہ اپنی بات کو بھول جائے۔ اور اگر بچہ اپنے کئے ہوئے وعدہ کو ہمیشہ نبھاتا رہے تو رسولؐ کی طرف سے تو (معاذ اللہ) وعدہ خلافی ہو ہی نہیں سکتی اب اگر رسولؐ اپنے وعدہ کے خلاف اسے جانشین بنائے بغیر چلا جائے تو ہم تو ادب سے کچھ نہیں کہیں گے مگر اللہ خاموش نہیں رہے گا بلکہ صاف طور پر

کہہ دے گا۔

۔ محمدؐ! تم نے اس دن وعدہ کیا تھا لہٰذا
اگر جانشین بنائے بغیر چلے گئے تو ہم یہی سمجھیں
گے کہ تم نے رسالت کا کوئی کام ہی نہیں کیا"

صاحبانِ ذوق!

بتاؤ! آج اس بچے کو جانشین بنائے بغیر چلے جانے سے رسولؐ کی پوری رسالت خطرے میں ہے یا نہیں؟۔

بہرکیف بچے نے نصرت کا وعدہ کر لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وقت آنے پر وہ "بچہ" اپنے اس وعدہ پر کس طرح قائم رہتا ہے۔

دیکھو نا!

جب اس بچے نے نصرت کا وعدہ کیا تھا۔ اس وقت گیارہ سال کا سن تھا۔ پیروں پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ جیب میں خرمے کی گٹھلیاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں آشوب تھا۔ کرتے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ گویا بالکل بچپن کی ادا تھی۔ اِدھر رسولؐ محفل برخاست کر کے چلے اِدھر یہ بچہ رسولؐ کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ جب رسولؐ مکے کے بازار سے گذرے تو کسی بازاری نے رسولؐ کی طرف انگلی اٹھا کے کہا "یہ ہے وہ رسولؐ جو ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے"

بڑے بھائیو!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ اِدھر اس آدمی نے یہ فقرہ کہا کہ "یہی ہے وہ رسولؐ جو تمہارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے" کہ اِدھر سے اس بچے نے جیب سے ایک گٹھلی نکالی اور تاک کے اسے ماردی۔ سینے پہ لگی تو کمر توڑ کر باہر نکل گئی۔ اب

لوگوں نے توبہ کر لی۔ کان پکڑ لیئے کہ اگر یہ بچہ محمدؐ کے ساتھ ہوا تو ہم محمدؐ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

سامعین!

ایک دفعہ میں نے یہ بات مجلس میں کہہ دی تو معترض کہنے لگا۔

"زیدی صاحب! یہ تو حسنِ اعتقاد ہے ورنہ بچے کی پھینکی ہوئی گٹھلی سے کمر ٹوٹ سکتی ہے!"

میں کہتا ہوں۔ اب تمہیں کون سمجھائے کہ اگر ابابیل کے پنجے کی پھینکی ہوئی مسور کے دانے کے برابر والی کنکر سے پورا ہاتھی ٹوٹ سکتا ہے تو بچے کے ہاتھ سے پھینکی ہوئی گٹھلی سے آدمی کا سینہ کیوں نہیں ٹوٹ سکتا؟۔

اب معترض کہتا ہے "زیدی صاحب! چھوڑو۔ وہ اور بات تھی"

میں نے پوچھا "کیا بات تھی"؟

کہنے لگا "زیدی صاحب! وہ تو بیت اللہ کی حفاظت تھی"

میں کہتا ہوں "بھئی! اگر وہ بیت اللہ کی حفاظت تھی تو یہ رسول اللہ کی حفاظت تھی۔ وہاں بھی اللہ تھا۔ یہاں بھی اللہ ہے جو اس کی دلیل ہے وہی اس کی دلیل ہے۔

حضور والا!

بچہ رسولؐ کے ساتھ رہا۔ ابھی موقع نہیں کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ بچہ کہاں تک ساتھ دے گا۔ بہر نوع اسی طرح چند سال اور گذر گئے۔ ایک دن ایسا

آیا کہ رسُول کو مکّہ چھوڑنا پڑا۔ گویا مکّہ میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ لہٰذا مکہ چھوڑ کر جانا پڑا۔ اور جانا بھی رات کے وقت ہے تاکہ کوئی دیکھنے نہ پائے چنانچہ ماہ صفرکی آخری رات ہے صبح کو ربیع الاول کا چاند نکلنے والا ہے اور رسُول ہجرت کی تیاری فرما رہے ہیں۔

بتاؤ! صفر کی آخری رات کتنی اندھیری ہے۔ آج اس اندھیری رات میں جانا ہے کیونکہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ اِدھر دشمنوں نے گھر گھیرا ہوا ہے اور جانا بھی ضروری ہے۔

سامعین!

ہماری اماں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب میں دن کے وقت اپنے گھر میں، اپنی سوئی کھو دیا کرتی تھی اور سورج کی روشنی میں وہ سوئی نہیں مل سکتی تھی مگر رات کو جب رسُول گھر تشریف لاتے تھے اور ابھی صحن میں ہی ہوتے تھے تو حجرے میں اتنی روشنی ہوتی تھی کہ دن کی کھوئی ہوئی سوئی رسُول کے چہرے کے نور کی روشنی میں مجھے نظر آجایا کرتی تھی۔

اب بتاؤ! (معاذ اللہ) ام المومنین کی کہی ہوئی بات غلط ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ گویا جس رسُول کا چہرہ سورج کی شعاعوں سے بھی زیادہ روشن ہو تو ایسے روشن چہرے والا آدمی جس گھر میں سوئے گا تو وہ پورا گھر رات کے وقت دن کی طرح روشن ہوگا یا نہیں؟ اور جب گھر سے باہر چلا جائے گا؟ تو گھر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ اور جو لوگ گھر گھیرے کھڑے تھے وہ اندھیرا دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ رسُول گھر سے باہر چلے گئے ہیں۔

لہٰذا اب رسُول کو اس بات کی ضرورت ہے کہ جانے سے پہلے ایسا انتظام کرے کہ اس کے بعد روشنی میں کمی نہ آنے پائے۔ گویا گھر اسی طرح

وشن رہے جس طرح رسُول کی موجودگی میں روشن رہتا تھا۔

بہرنوع رسُول نے ایسا انتظام فرما دیا کہ اس کے بعد بھی گھر روشن رہا
ب میں اس تفصیل میں کہاں پڑوں کہ کس طرح انتظام فرمایا۔ بہرنوع رسُول
ے جو مناسب سمجھا کر دیا۔ لیجئے اس روشنی کا دوسرا پہلو ملاحظہ فرمائیے

دیکھونا !

میں اپنے گھر سے چھُپ کر باہر جانا چاہتا ہوں تاکہ کوئی مجھے دیکھنے
پائے اور ہاتھ میں جلتا ہوا ایک گیس پکڑ لوں تو بتاؤ۔ وہ
گیس کی روشنی مجھے چھپنے دے گی ؛ ہرگز نہیں۔ میں چاہے جتنا ہی چھپ
جاؤں مگر وہ روشنی بتا دے گی کہ میں جا رہا ہوں۔

حضُور والا !

سمجھ نہیں آتا کہ رسُول نے اپنے گھر میں روشنی کا انتظام تو کر لیا ہوگا
مگر خود جس گلی سے گذرے گا تو رسُول کے چہرے کی روشنی ہی بتائے
گی وہ جا رہا ہے۔ لہٰذا رسُول کو ایسا انتظام بھی کرنا چاہیئے کہ چہرے
کے نور کی روشنی چھپی چلی جائے۔ بہرنوع رسُول نے جہاں اپنے
گھر میں روشنی کا انتظام فرمایا وہاں اُپنے ساتھ ساتھ
اندھیرے کا انتظام بھی کر لیا ہوگا۔ تاکہ نور کسی کو نظر
نہ آئے اور ظلمات کے سائے میں چھپا رہے

بہرنوع رات کا وقت ہے۔ رسُول نے گھر سے جانا ہے اور دشمنوں
نے گھر گھیر رکھا ہے مگر جانا بھی ضرور ہے۔

بچّو ! اب تم ہنسو گے مگر میں کہہ رہا ہوں جو
میں نے کہنا ہے۔

دیکھونا !
میں لاہور سے کراچی پہنچا اور آپ کے گھر میں
ٹھہر گیا۔ آپ نے میرے لئے بہترین کھانا پکوایا
بہترین بستر بچھوایا۔ کھانا کھا کر سونے کیلئے
رات کو بستر پہ لیٹ گیا۔ آدھی رات کے قریب
گھر کا مالک گھبرایا ہُوا میرے پاس آیا اور کہنے
لگا۔" زیدی صاحب! غضب ہو گیا۔ دشمنوں
نے میرا گھر گھیر رکھا ہے،
میں نے پوُچھا" بھئی۔ خیریت تو ہے۔ بڑے پریشان
ہو" وہ بولا" زیدی صاحب! خیریت بالکل نہیں
دشمنوں نے مسلح ہو کر میرا گھر گھیر رکھا ہے
لہٰذا خطرہ ہے۔
اب بتاؤ!
جب گھر کا مالک اتنا خطرہ محسوس کر رہا ہو تو مجھ مہمان پر کیا گذر رہی
ہو گی؟ یقیناً میں اس سے زیادہ ڈر جاؤں گا۔ لہٰذا میں بھی اٹھ کے
بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔
"اگر اتنا خطرہ ہے تو میں کیا کروں؟"
وہ بولا۔" زیدی صاحب! خطرہ بہت زیادہ ہے۔ دشمنوں نے
گھر گھیر رکھا ہے"
میں نے پوچھا" پھر میں کیا کروں؟"
وہ بولا" میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ خطرہ ہے"

میں نے گھبرا کے پوچھا "میں ؟"
وہ بولا "تم یہیں رہو۔ کیونکہ خطرہ ہے"

سامعین!
بتاؤ۔ اگر میں انکار کر دوں کہ "میں تو اس خطرے میں نہیں رہنا چاہتا" تو میرا یہ کہنا اخلاقاً کوئی بُرا ہوگا! ہرگز نہیں۔

بس بھائیو!
اب ساری کائنات کی نظریں علیؑ پہ لگی ہوئی ہیں کہ جواب میں کیا کہتا ہے۔ کیونکہ گھر کے مالک، جس کا چار آدمی لحاظ کرتے ہیں، وہ تو گھر چھوڑ کر جا رہا ہے کیونکہ خطرہ ہے اور دوسرے کو یہ کہتا ہے کہ تم یہیں رہو۔ کیونکہ خطرہ ہے۔

گویا جو جا رہا ہے۔ اس کی عمر ترپن ۵۳ سال کی ہے اور جسے گھر چھوڑ رہا ہے اس کی عمر انیس ۱۹ سال کی ہے۔ جس کے جینے کے دن ہیں۔ زندہ رہنے کا زمانہ ہے۔ اُسے کہا یہ جا رہا ہے۔

"برخوردار! تم یہیں رہو کیونکہ خطرہ ہے"
اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ بچہ جواب میں کہتا کیا ہے؟
مگر کائنات نے دیکھا اور چشمِ فلک نے ستاروں کی عینک لگا کر دیکھا کہ وہ بچہ جو نصرت کا وعدہ کر چکا ہے۔ رسُولؐ کے کہنے پر کہ "تم یہیں رہو کیونکہ خطرہ ہے" یہ سُن کر مسکرا کر جواب دیتا ہے۔

"محمدؐ! گھبراؤ نہیں۔ میں یہاں ہوں۔ تم جا سکتے ہو"

بس صاحبان!
بچے کا یہ کہنا تھا کہ کائنات سے "واہ واہ" کی آوازیں آنے لگیں
اور چشم فلک نے ستاروں کی عینک لگا کر یہ منظر دیکھا۔ دنیا بھر نے
سبحان اللہ کہا بہرنوع بچہ یہ کہکر لیٹنے لگا کہ رسول نے فرمایا۔
"بیٹا! ابھی ٹھہرو۔ دیکھونا! تمہارے بستر پہ
کوئی خطرہ نہیں۔ اصل خطرہ تو ہمارے بستر پہ ہے
بستر پہ لیٹ جاؤ"
چنانچہ وہ بچہ رسول کے بستر پہ لیٹ گیا اور فرمایا۔
"قبلہ! میں لیٹ گیا ہوں۔ اب آپ جا سکتے
ہیں۔"
رسول نے فرمایا:"نہیں۔ صرف لیٹنا ہی ضروری نہیں
ہے۔ کیونکہ تم "تم" ہو کے لیٹے تو پھر کوئی
خطرہ نہیں لہٰذا تم ہمارے بستر پہ "ہم"
بن کر لیٹو کیونکہ خطرہ ہے"
اور دیکھو!
تم نے اچھی طرح سے "ہم" نہیں بنا جائیگا
لہٰذا ہم خود تمہیں "ہم" بناتے ہیں،
یہ کہہ کر رسول نے بچے کو لٹا کر اپنا عمامہ اس کے سرہانے رکھ دیا
اور اپنی چادر اُوپر اُوڑھا دی اور غور سے دیکھا اور فرمایا۔
"کیوں بیٹا! بن گئے ہم"
بچے نے عرض کی "قبلہ! ہاں۔ بن گئے ہم"

اِدھر ہم نے عرض کی: "یارسُول اللہ! یہ کیا بنا رہے ہو؟
رسُول نے فرمایا "میں اسے "ھم" بنا رہا ہوں"
ہم نے عرض کی "قبلہ! کیا یہ ہم بن گیا؟"
رسُول نے فرمایا "نہیں۔ میں نے اسے "ھم" کی شبیہ بنایا ہے"
گویا یہ بچّہ محمّد نہیں بنا بلکہ محمّد کی شبیہ بنا ہے"
ہم نے عرض کی "قبلہ! شبیہ کس طرح بنائی؟"
رسُول نے فرمایا "عمامہ رکھ کے، چادر ڈال کے شبیہ بنالی"
گویا عمامہ رکھ کے، چادر ڈال کے شبیہ بنانا سنتِ
رسُول ہے۔

سامعین!

یہ کہہ کر رسُول چلے گئے اور سونے والا بسترِ رسُول پر سو گیا۔ اور بستر کی
سلوٹ گواہ ہے کہ صبح تک سونے والے نے کروٹ ہی نہ بدلی اور ادھر کبھی نہ
سونے والے نے سونے والے کو دیکھا۔ سونا پرکھا بالکل کھرا سونا
بڑا لاجواب سونا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے کہا۔
"محمّد! سنتے بھی ہو۔ ایسا سونا روز روز نہیں ملتا لہٰذا آج اسے ہم نا
خرید لیں"
رسُول نے عرض کی "خداوندا! اگر تو خریدنا چاہتا
تو خرید لے"
اعلیٰ حضرت نے کہا "محمّد! تو سونے والے" سے ہماری
بات کروا دو"
چنانچہ محمّد نے وہیں سے آواز دی "سونے والے!"

سونے والے نے عرض کی " قبلہ ! کیا حکم ہے ؟ "
رسولؐ نے فرمایا " سونے والے ! سونا بیچتے ہو؟
سونے والے نے عرض کی " جی ہاں ۔ بیچتے ہیں "
رسولؐ نے پوچھا " کیا لوگے ؟ "
سونے والے نے پوچھا " خریدار کون ہے ؟ "
رسولؐ نے فرمایا " اللہ "
سونے والے نے پوچھا " وہ کیا دے گا " ؟
رسولؐ نے فرمایا تم کیا لوگے "؟
سونے والے نے کہا " قبلہ ! تم بتاؤ ۔ وہ کیا دیگا ؟
آخر جب بڑی دیر ہو گئی تو سونے والے نے یہ کہہ کر فیصلہ کیا کہ ۔
" جب سونے کا اللہ خریدار ہے تو اس سے جھگڑا کیا کرنا ہے
جو اس کی " مرضی " ہو وہ دے دے "
بہر نوع " خدا کی مرضی " سونے کی قیمت ہو گئی ۔ سونے والے نے عرض کی ۔
" خداوندا ! ہمیں ہماری قیمت دو "
خدا نے فرمایا " یوں نہیں ۔ آج ہم تمہیں قیمت نہیں دے سکتے ۔ یہ ہم پر اُدھار رہی ۔ انشاء اللہ قیامت کے دن اُدا کر دیں گے "
سونے والے نے عرض کی ۔ " خداوندا ! سودا پکا کرنے کے لئے کچھ بیانہ چاہیئے "
خدا نے کہا " ٹھیک ہے ۔ قیمت تو قیامت میں ملیگی

مگر بطور بیانہ ہم تمہیں "جنت" دیتے ہیں۔
لہٰذا آج سے تم اسے اپنے قبضہ میں کر دو،
چنانچہ رات کو جنت قبضہ میں آگئی۔ اب جو صبح کو اُٹھے تو مالکِ جنت تھے۔ سال بعد جو جڑے گھر کی بیٹی سے شادی ہوئی تو اپنی دُلہن کو منہ دکھائی میں وہی رات والی جنت دے دی۔ گویا شوہر نے حاصل کی اور بیوی خاتونِ جنت کہلائی۔ اِدھر بیوی نے یہ کیا کہ شوہر والی جنت کو بچوں کے نام منتقل کر دیا اور رسُول نے انتقال کی تصدیق فرما دی۔
"الحسن والحسین سید اھل الشباب جنۃ"
گویا خُدا کی دی ہوئی جنت باپؑ نے خریدی ماںؑ خاتونِ جنت بنی اور بچے مالکِ جنت بنے۔ اب یہ جنت ان مالکوں کی ہے۔ لہٰذا ان سے شناسا رہنا۔ ان سے واقف رہنا۔ ان سے متعلق رہنا کیونکہ جنت میں جانے کے لئے ان کی واقفیت کام آئے گی۔

سامعین !

اَب ہم پوچھتے ہیں "خُداوندا! جنت دے گا؟"
اللہ جواب میں فرماتا ہے "کیوں خوا مخواہ کے لئے میرا سر کھاتے ہو۔ جاؤ۔ اس سے بات کرو جس نے خریدی ہے۔ جنت جانے اور اس کی مرضی جانے کیونکہ میں تو مرضی کے عوض جنت بیچ چکا ہوں۔"

حضور والا !

مکہ سے ہجرت فرما کر رسُول مدینے تشریف لائے اور جہاں جہاں بھی رسُول کو نصرت کی ضرورت پڑتی رہی وہاں وہاں نصرت کا وعدہ کرنے والا

کی نصرت کرتا رہا۔ گویا جب رسولؐ نے نصرت کے لیئے پکارا نصرت کرنے والا نصرت کے لیئے پہنچتا رہا۔

بہرنوع۔ اللہ نے نصرت کرنے والے کو حسنؑ و حسینؑ جیسے دو بیٹے عطا فرمادیئے۔ ادھر علیؑ دیکھ دیکھ کے بڑے خوش ہوتے اور فرماتے۔

"یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے حسنؑ و حسینؑ جیسے فرزند عطا فرمائے ہیں لہٰذا میں نے جو نصرتِ رسولؐ کا وعدہ کیا تھا، میرے بعد میرے بیٹے اس وعدہ کو پورا کریں گے"

صاحبان!

ادھر علیؑ خوشی کر ہی رہے تھے کہ رسولؐ پر آیہ مباہلہ نازل ہوئی

"اے رسولؐ! جب کل عیسائیوں کے مقابلے میں جاؤ۔ تو

"اَبنَاءَنَا وَاَبنَاءَکُم" اپنے بیٹوں کو لے کر جانا

"نِسَاءَکُم" اپنی نساء کو لیکر جانا۔ اور

"اَنفُسَکُم" اپنی جان کو لیکر جانا"

حضور والا!

اب جو یہ آیت رسولؐ پر نازل ہوئی تو تمام کائنات نے سُنی کہ "رسولؐ کل اپنے ساتھ اپنے بیٹے، نساء اور جان کو لیکر جائیں گے"

لوگوں کو رسولؐ کی جان کی تو پہلے ہی جان پہچان تھی کہ جان علیؑ کون جائے گا۔ اور نساء کے متعلق بھی اطمینان تھا کہ چشم بد دور نو بیویاں موجود ہیں۔ بیٹی بھی موجود ہے مگر ابناء کے متعلق ہر جگہ تذکرے ہو رہے تھے۔ کیونکہ اچھے شاگرد اپنے استاد کے بیٹے ہوتے

ہیں۔ اور اچھے مرید اپنے پیر کے بیٹے ہوتے ہیں۔

لہٰذا لوگوں نے سوچا "آخر ہم رسولؐ کی اُمت ہیں۔ کل کو ہم میں سے ہی کوئی بیٹا بنے گا"

چنانچہ ساری رات مدینے کے بازار کھلے رہے۔ دُکانوں پہ حجامتیں بنتی رہیں۔ غسل ہوتے رہے۔ کپڑے بدلے گئے۔ عطر لگائے گئے۔ رات بھر تیاریاں ہوتی رہیں کہ کل کو رسولؐ کا بیٹا بن کے جائیں گے۔ گویا رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہے اور صبح کی نماز کے وقت مسلمانوں سے مسجد نبوی چھلک اٹھی۔ رسولؐ نے نماز پڑھائی۔ نماز پڑھنے کے بعد مڑ کے دیکھا اور یہ آیت پڑھی "وقل ندعوا ابناءنا وابناءکم ..... الخ"

رسولؐ کی آواز سنکر ہر صف سے آواز آئی "قبلہ! میں بھی ہوں"

تھوڑی دیر بعد رسولؐ نے فرمایا "حسنؑ بیٹا ! اِدھر آؤ"

حسنؑ تشریف لائے۔ پھر فرمایا "حسینؑ بیٹا! تم بھی آؤ"

حسینؑ بھی تشریف لائے۔ جب دونوں شہزادے آگئے تو رسولؐ نے ایک شہزادے کو دائیں طرف بٹھایا اور دوسرے شہزادے کو بائیں طرف بٹھایا اور سامعین کی طرف مسکرا کر فرمایا۔

"مسلمانو! دیکھ لو۔ یہ میرے "ابناء" ہیں۔ مسلمانوں میں سے کسی نے عرض کی "قبلہ! ہم؟"

رسولؐ نے فرمایا "تم۔ اب نہ آنا"

بہر نوع رسولؐ نے کہہ دیا کہ یہ ہیں میرے ابناءنا۔

اور یا علیؑ! دیکھو۔ تم میری جان بنکر چلو"

سامعین! رہ گیا نساءنا" اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ

عربی کی لغت میں نساء کے تین معنیٰ ہیں " ماں " بیوی - یا " بیٹی"
اب اگر "ماں" تصور کریں تو وہ اس آیت کے نزول سے پہلے ہی فوت
ہو چکی تھی - معلوم ہوا کہ "نساء" سے مُراد یا تو بیوی ہے یا "بیٹی" اِدھر رسُولِ
نے سوچا کہ اگر بیوی کو لے جاؤں تو بیٹی بُرا مان جائے گی اور اگر بیٹی کو
لے جاؤں تو بیوی بُرا مان جائے گی - چنانچہ رسُول نے فرمایا:-

" یا علیؑ ! تم میرے ساتھ میری "جان" بنکر چلو -
حسنینؑ بیٹا ! تم میرے ساتھ میرے بیٹے بن کے
چلو - اور سیّدہؑ ! تم ہمارے ساتھ "نساء"
بن کے چلو - تاکہ ساتھ جانے والوں میں سے کسی
کی بیٹی بن جاؤ - کسی کی "ماں" بن جاؤ اور کسی کی
بیوی" بن جاؤ "

بہرکیف رسُول اپنی "جان" بیٹوں اور نساء کو لیکر میدانِ
مباہلہ سے کامیاب ہو کر گھر کو جو لوٹے تو علیؑ و سیدہؑ بڑے خوش تھے
حسنینؑ بھی خوش خوش کھیلتے ہُوئے گھر آ گئے - اب جو حسنینؑ کو آتے دیکھا
تو علیؑ و فاطمہؑ دونوں تعظیم کو کھڑے ہو گئے -

بچوں نے عرض کی " بابا جان ! یہ کیا ہو رہا ہے ؟
علیؑ و سیّدہؑ نے عرض کی " شہزادو ! اس آیت سے پہلے تم ہمارے
بیٹے تھے - مگر اس آیہ مباہلہ کو اُتار کر اللہ نے تم دونوں کو محمدؐ کا بیٹا
بنا دیا ہے - لہٰذا اب تم فرزندِ رسُول ہو - اب قیامت تک تمہاری زیارت
یہ کہہ کر پڑھی جائے گی - اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ " لہٰذا اب
ہم تمہیں اپنا بیٹا نہیں کہہ سکتے بلکہ دونوں آج سے رسُول کے بیٹے ہو

اس لئے تمہاری تعظیم ہم پر فرض ہے۔

سامعین!

دن گذر گیا۔ رات آئی۔ رات کو دونوں شوہر بیوی۔ علیؑ و فاطمہؑ وضو کر کے مصلّے بچھا کر بیٹھ گئے اور خداوند عزاسمہٗ وجل جلالہٗ کی خدمت میں عرض کرنے لگے۔

"خداوندا! ہم تو خوش تھے کہ تو نے ہمیں حسنؑ وحسینؑ جیسے فرزند عطا کئے ہیں مگر آج آیہ مباہلہ کے بعد حسنینؑ محمدؐ کے بیٹے ہو گئے"

علیؑ نے کہا "خداوندا! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ جب حسنؑ وحسینؑ محمدؐ کے بیٹے ہیں تو ایک بیٹا مجھے بھی عطا کر دے جو دنیا میں میرا بیٹا ہو کے رہے۔ چونکہ میں نے محمدؐ کی نصرت کا وعدہ کیا ہے۔ لہٰذا ایسا بیٹا عطا فرما جو میرے بعد محمدؐ کے بیٹوں کی نصرت کے وعدے کو پورا کرے"

اِدھر سیدہؑ نے دعا کی۔ "خداوندا! علیؑ کو ایسا بیٹا دینا جو علیؑ کا وارث بنے۔ مگر مجھے بھی ایک بیٹی دے دے جو میری وارث بن کے رہے۔

خدا نے کہا "علیؑ تمہاری دعا بھی قبول ہو گی اور سیدہؑ تمہاری دعا بھی منظور ہو گی۔ تم دونوں کو ایسے بیٹے دوں گا جو قیامت تک تمہارے نام کو زندہ رکھیں گے۔

سامعین کرام!

میں اپنی گفتگو کو یہاں آکر ختم کرتا ہوں کہ ایک دن حضور امیر علیہ السلام نے اپنے بڑے بھائی جناب عقیلؑ کو بلوا بھیجا اور جب عقیلؑ تشریف لائے

تو عرض کی۔

"عقیلؑ بھائی! تم میرے بڑے بھائی ہو اور بڑا بھائی دُنیا میں باپ کے برابر ہوتا ہے۔ آج میں آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ عرب کے تمام قبیلوں سے واقف ہیں لہٰذا آپ میری شادی کسی ایسے قبیلے میں کروا دیں جو عرب بھر میں شجاعت میں مُسلّم ہو تاکہ بہادر قبیلہ کی خاتون سے جو میرا بیٹا پیدا ہو وہ میری بہادری کا وارث کہلائے"

عقیلؑ نے جواب دیا۔

"یا علیؑ! عرب میں بہادر ترین قبیلہ "بنی کلاب" ہے لہٰذا میں آج ہی ان کے پاس جا کر تمہاری خواستگاری پیش کرتا ہوں"

سامعین!

قبیلہ بنی کلاب بڑا ہی بہادر قبیلہ تھا اور عرب کے مشہور بہادر اپنی تلواروں پر اس قبیلے کے بہادروں کے نام کندہ کروایا کرتے تھے۔ گویا بہادر قبیلہ تھا اتفاق سے ان دنوں مدینہ کے قریب ہی بنی کلاب ٹھہرا ہوا تھا۔ چنانچہ صبح کو عقیلؑ وہاں پہنچے اور ایک نخلستان میں جا کے بیٹھ گئے اور سردار قبیلہ کو اطلاع کر دی۔ شیخ قبیلہ اپنے جوانوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ جب اس نے دیکھا کہ عقیلؑ ابن ابی طالبؑ ہیں تو فوراً پاؤں پہ گر گیا اور عرض کی۔

"ابی طالبؑ کے شہزادے! بیضتہ البلد کے بیٹے! امام العرب کے بیٹے! سیدالقوم کے فرزند! آپ ہمارے قبیلے کے پاس آئے ہیں۔ ہماری

عزّت بڑھی ۔ غلاموں کے خیمے موجود ہیں لہٰذا
ہمارے خیموں میں فروکش ہوں "
چنانچہ عقیلؑ شیخ قبیلہ کے خیمے میں تشریف لائے اور تین دن کی مہمانی
کے بعد شیخ قبیلہ دست بدستہ سامنے کھڑے ہو کر عرض کرنے لگا ۔
" حضور ! ہے تو گستاخی مگر پوچھ سکتا ہوں
کہ حضور نے کیوں تکلیف فرمائی ؟
عقیلؑ نے کہا " شیخ ! تم علیؑ ابن ابی طالبؑ کو جانتے ہو ؟
شیخ نے عرض کی " سبحان اللہ ۔ علیؑ کو کون نہیں جانتا ۔ کوئی
بے جان ہی ہو گا جو علیؑ کو نہ جانتا ہو "
عقیلؑ نے کہا " شیخ ! تمہارے خاندان میں علیؑ کی
شادی کرنا چاہتا ہوں "
شیخ قبیلہ حیران ہو کے پوچھتا ہے ۔
" قبلہ ! علیؑ کی شادی ہمارے خاندان میں چاہتے
ہیں ؟ ہمارے خاندان کی اتنی عزت کہ علیؑ ہمارا
داماد بنے ؟ حضور ! میری ایک ہی لڑکی ہے اسے
اپنی غلامی میں قبول فرمایئے گا "
یہ کہہ کر شیخ قبیلہ گھر آیا اور بیوی سے کہنے لگا ۔
" سُنتی بھی ہو ۔ بیٹی کا رشتہ آیا ہے ۔ مبارک ہو "
بیوی نے پوچھا " کہاں سے آیا ہے ؟ "
شیخ نے کہا " پہلے دو رکعت نماز شکرانہ پڑھو ۔ پھر بتاؤں گا "
چنانچہ جب خاتون نے دو رکعت نماز پڑھ لی تو شیخ کہتا ہے ۔

"علیؑ کا رشتہ آیا ہے"
بیوی پوچھتی ہے "کون علیؑ؟"
شیخ کہتا ہے "علیؑ ابن ابی طالبؑ"
یہ سُنکر بیوی حیران ہو کر پوچھتی ہے۔
"شیخ! وہی علیؑ جو محمدؐ کا داماد ہے!" "وہی ہمارا داماد بنے گا۔ سبحان اللہ! اس رشتے سے بہتر تو کوئی رشتہ ہے ہی نہیں"
چنانچہ لڑکی سے جب پُوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔
"میں اتنا جانتی ہوں کہ رات خواب میں ایک خاتون میرے پاس آئی تھی۔ جس نے مجھے دُلہن بنایا اور فرمایا تھا۔
"مبارک ہو۔ تو میرے بیٹے کی ماں بنے گی"
بہر نوع رشتہ منظور ہو گیا۔ نکاح ہُوا اور ام البنین کو بنی ہاشم اپنے جھرمٹ میں لیکر علیؑ کے گھر لائے۔ ڈیوڑھی کے سامنے ناقہ بٹھایا گیا۔ ام البنین محمل سے اُتریں۔ چوکھٹ کو چُوما اور چوکھٹ پہ جا کے بیٹھ گئیں۔ بنی ہاشم نے کہا۔ "بی بی! اندر چلیے"
ام البنین نے فرمایا "نہیں۔ اس گھر کی مالک فاطمہؑ ہے۔ میں تو فاطمہؑ کی ادنیٰ سی کنیز ہوں۔
زینبؑ آگے بڑھی اور عرض کی "اماں آؤ نا"
ام البنین نے کہا "بی بی! مجھے اماں نہ کہو۔ میں تمہاری کنیز ہوں۔ تمہارے باورچی خانے میں خدمت کرنے آئی ہوں۔

بہرکیف اُم البنین علیؑ کے گھر میں آگئیں اور ایک سال بعد خدا نے بطن ام البنین سے علیؑ کو ایک بیٹا عطا فرمایا۔ علیؑ مسجد میں تھے کہ ایک خاتون نے عرض کی۔

"یا علیؑ! مبارک ہو۔ خدا نے بیٹا عطا فرمایا ہے"

چنانچہ علیؑ گھر میں پہنچے۔ اُم البنین کی گود میں بیٹا دیکھ کر فرمایا۔

"ماشاءاللہ۔ وہی ہے جس کی مجھے تمنّا تھی"

اُم البنین نے عرض کی۔

"یا علی! بچہ تو بڑا حسین مگر اس نے ابھی تک آنکھ نہیں کھولی"

علیؑ نے فرمایا۔ "آنکھ کس طرح کھولتا۔ آخر میرا بیٹا جو ہوا"

یہ کہکر علیؑ نے فضّہؓ سے فرمایا۔

"فضّہؓ! ذرا میرے حسینؑ کو تو بلاؤ"

حسینؑ تشریف لائے۔ علیؑ نے فرمایا۔

"حسینؑ! بھائی مُبارک ہو"

حسینؑ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ پھیلائے۔ اور فرمایا۔

"اَمّاں! میرے بھائی کو میری گود میں دو"

اُم البنین نے بچے کو آگے پھیلا دیا۔ اِدھر بچے نے آنکھیں کھولنے سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ حسینؑ کی طرف پھیلا دیئے۔ گویا بچہ یہ کہہ رہا تھا۔

"مولا! آنکھیں تو بعد میں کُھلتی رہیں گی پہلے میرے دونوں ہاتھوں کا نذرانہ قبول فرمائیے گا"

حسینؑ نے بچے کو گود میں لیا اور بچے نے آنکھیں کھول دیں۔ اِدھر

علیؑ دیکھتے رہے اور آنسو پونچھتے رہے۔ اور بچہ حسینؑ سے اس طرح چمٹ گیا جیسے پرانا واقف ہو۔

بہرکیف حسینؑ کی گود سے علیؑ نے اٹھایا۔ ایک کان میں اذان کہی اور ایک کان میں اقامت کہی۔ جب اذان و اقامت کہہ چکے تو بی بی زینبؑ نے عرض کی۔

"بابا جان! یہ بچہ مجھے دو"

چنانچہ بھائی کو زینبؑ نے گود میں لے لیا اور بچے کے کان میں بڑی دیر تک بات کرتی رہی۔

علیؑ نے پوچھا "زینبؑ تم نے کیا بات کی؟"

زینبؑ نے عرض کی۔

"بابا جان! میں نے اماں کی وصیت پوری کی ہے کہ وہ مرتے وقت کہہ گئی تھی کہ "ام البنین" کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوگا جس کا نام عباس ہوگا۔ جب وہ پیدا ہو تو اسے میرا سلام کہنا۔ لہٰذا میں نے کہا ہے۔

"عباس بھائی! اماں سلام کہتی تھی۔

عباس بھائی! تو ہی میری چادر کا نگہبان ہوگا!

بہرکیف بچہ پلتا رہا۔ جب تین چار سال کا ہوا تو ام البنین نے بچے کو سمجھایا کہ۔

"بیٹا! جب تم زینبؑ کے سلام کو جایا کرو تو نظریں پاؤں سے اوپر نہ ہونے پائیں۔

دیکھو! وہ شہزادی ہے اور تو کنیز زادہ ہے۔ بیٹا!

کہیں حسینؑ کے برابر نہ بیٹھ جانا "

عزادار سیّد الشہداءؑ!

مظہر العجائب باپ کا مظہر العجائب بیٹا، حسینی سرکار کا اسی طرح محافظ تھا جس طرح رسولؐ کے دربار کا علیؑ محافظ تھا۔ اگر حسینؑ کہیں خط لکھتے تو کاتب عباسؑ ہوتے۔ اگر حسینؑ کہیں جہاد میں جاتے تو سپہ سالار عباسؑ ہوتے۔ اگر حسینؑ گھر میں بیٹھتے تو گھر کا منتظم عباسؑ۔ حسینؑ کے بچوں کا بہلانے والا عباسؑ۔ حسینؑ کی مستورات کو تسلّی دینے والا عباسؑ۔ غرض حسینی سرکار کے تمام کام اس نوجوان کے سپرد تھے۔ گویا مظہر العجائب کا مظہر العجائب بیٹا تھا۔ آج ہم بھی اسے مظہر العجائب مانتے ہیں۔

خدا شاہد ہے۔ جو لطف "یا علیؑ" کہنے میں آتا ہے۔

وہی لطف "یا عبّاس" کہنے میں آتا ہے۔ گویا عباسؑ اسی طرح مشکل کشا ہے۔ جس طرح "علیؑ" مشکل کشا ہے۔

بزرگانِ من!

جو صاحبان کربلا کی زیارت کر چکے ہیں وہ ذرا اپنے تصور میں کربلا کے شہر کو لائیں تو پتہ چلے گا کہ عباسؑ غازی کربلا میں کس شان سے ہیں۔ گویا کربلا کا شہر دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح مشرقی بادشاہوں کے شہر ہوں۔ سارا شہر چاروں طرف ہے اور درمیان میں شہنشاہ کا محل ہے جسے بڑا "حرم" کہتے ہیں۔ اگر شہنشاہ کے محل میں داخل ہوں تو سامنے شہنشاہ کے پرائیویٹ سیکرٹری "حبیبؓ" کا روزہ ہے اندر جائیں تو شہنشاہ کی آرام گاہ ہے۔ اور ساتھ ہی باڈی گارڈ کا رسالہ ہے جسے گنج شہیداں کہتے ہیں۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر

حسینی سرکار کی زنانہ محل سرا ہے جسے خیمہ گاہ کہتے ہیں۔ شہر سے باہر کھلے میدان میں حسینی سرکار کا مہمان خانہ ہے جس میں حُر مہمان ٹھہرا ہوا ہے اور نہر کے کنارے حسینی سرکار کے کمانڈر انچیف کا بنگلہ ہے جس پر آج بھی حسینی سرکار کا پرچم لہرا رہا ہے۔

بہرنوع وہ بڑے حضور کی درگاہ ہے۔ اور یہ چھوٹے حضور کا حرم ہے

سامعین!

میں ایک دن سید الشہداء کے حرم میں گیا۔ ضریح پکڑ کر عرض کی۔

مولا! تو نے کتنا شاندار شہر بسایا ہے۔ دنیا بھر کے زائرین تیرے سلام کو آتے ہیں۔ سامنے چھوٹے بھائی کا روزہ ہے۔ خیمہ گاہ بھی ہے۔ گویا ہر شے اپنی جگہ پر مناسب ہے۔ مگر

مولا! ایک کسر رہ گئی۔ اگر وہ بھی پوری ہو جاتی تو تیرے شہر جیسا شہر کوئی نہیں تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر دونوں بھائیوں کی قبروں کے بیچ میں زینبؑ کا روزہ بھی ہوتا تو کیا شان تھی!

مولا! کمال ہو جاتا کہ زینبؑ کے روضہ پہ بیٹھ کر تجھے بھی رو لیتے اور عباسؑ کو بھی رو لیتے۔

حضور والا!

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فوراً خیال آیا کہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ دونوں بھائیوں نے کربلا فتح کیا تھا۔ لہٰذا یہ دونوں اپنے مفتوحہ علاقے میں ہیں اور زینبؑ نے چونکہ شام فتح کیا ہے۔ اس لئے وہ اپنے مفتوحہ علاقے میں ہے گویا سید الشہداء اور عباسؑ غازی اپنی بہن زینبؑ

کی زیارت کو شام جاتے ہیں اور بی بی کربلا میں تشریف لاتی ہیں۔

اور یاد رکھو!

عباسؑ غازی حسینی فوج کا کمانڈر انچیف ہے اس لئے ہم نے لحاظ رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سید الشہداؑ اور دوسرے آئمہ طاہرینؑ کی نذر میں دی ہوئی چیز کو ہم "نیاز" کہتے ہیں ور جناب عباسؑ غازی کی نذر میں دی ہوئی چیز کو ہم "حاضری" کہتے ہیں۔ لفظ "حاضری" اصطلاحی لفظ ہے کیونکہ اگر بادشاہ کی خدمت میں جائیں تو اسے نیاز کہتے ہیں اور اگر سپہ سالارؑ کی خدمت میں جانا ہو تو اسے حاضری کہتے ہیں۔

عزادارِ سیدالشہداءؑ!

بی بی زینبؑ کو عباسؑ غازی پر اتنا اعتماد تھا کہ شب عاشور زینبؑ نے تمام عورتوں کو اپنے خیمے میں بلا کر کہا۔

"بی بیو! گھبراؤ نہیں۔ تمہارے پردے کی میں ذمہ دار ہوں کیونکہ عباسؑ جیسا میرا بھائی موجود ہے"۔

زینبؑ کی یہ بات سنکر تمام خواتین خاموش ہو گئیں۔ وقت گذرتا گیا صبح عاشور آ گئی اور میدانِ شہادت گرم ہو گیا۔ جب تمام عزیز و اقارب جامِ شہادت پی چکے تو عباسؑ علمدارِ حسینیؑ سرکار کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے۔

"مولاؑ! میری تمام فوج ختم ہو گئی لہٰذا میں بھی مرنا چاہتا ہوں۔ مولاؑ! مجھے اجازت دو

کیونکہ کوثر پہ میرے بابا ھی میرا انتظار کر
رہے ہیں۔

حسینؑ نے جواب دیا۔
"عباس! تم میرے علمبردار ہو"

عباسؑ نے عرض کی۔
"مولا! وہ فوج اب کہاں ہے جس کا میں علمبردار ہوں"
عباس کا یہ فقرہ سنکر امامؑ نے سوچا کہ اگر عباس کو روک لیا تو وہ غم سے ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ حکم تو دے دیا کہ "تم جا سکتے ہو" مگر لڑائی سے روکنے کے لئے یہ بھی کہہ دیا کہ "عباس بھائی! اگر ہو سکے تو بچوں کی مشک پانی سے بھر لو"

سامعین!
میں نے آج تک مقتل کی کسی کتاب میں یہ نہیں پڑھا کہ مولا نے عباسؑ سے یہ کہا ہو کہ "مشک میں پانی لا دو" بلکہ یہی فرمایا کہ مشک میں پانی بھر لو۔ کیونکہ اگر پانی لے آؤ۔ کا حکم ہوتا تو پانی لازماً آتا۔ مگر یہاں صرف مشک بھرنے کا حکم تھا۔ چنانچہ عباسؑ خیمے میں آئے اور سکینہ کا مشکیزہ اٹھا کر نہر کی طرف چل پڑے ادھر سکینہؑ نے تمام بچوں سے کہہ دیا۔
"بچو! گھبراؤ نہیں۔ میرا چچا سقا بن کے جا رہا ہے۔ پانی ضرور ملے گا"
چنانچہ سب بچے خالی کوزے لیکر سکینہؑ کے گرد کھڑے ہو گئے اور عباسؑ نے روانگی پہ بی بی زینبؑ کو سلام کیا حسینؑ کو سلام کیا اور جب اپنی زوجہ کے خیمہ میں پہنچے تو دیکھا کہ فضلؑ پاس بیٹھا ہے اور زوجہ

یہ کہہ رہی ہے ۔

" سرتاج ! تم نے بڑی دیر کر دی "

عباسؑ نے کہا ۔

" فضلؑ کی ماں ! میرے لئے تو " بیوہ " ہو جائے گی "

حضور والا !

ایک شاعر عالم ارواح میں اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ جب عباسؑ نے کہا کہ فضل کی ماں ! تو بیوہ ہو جائے گی " تو بی بی جواب میں فرماتی ہیں ؎

کچھ غم نہ کریں آپ پہ پروان چڑھیں گے
میں قبر کو جھاڑوں گی یہ قرآن پڑھیں گے

بہر نوع عباسؑ گھوڑے پہ سوار ہوئے ۔ میدان میں پہنچے اور علم کا پنجہ برابر خیمے کے خس میں نظر آرہا ہے ۔ زینبؑ کی نظر علم کے پنجے پہ جمی ہوئی ہے ۔ یتیم بچے اپنے ہاتھوں میں خالی کوزے لئے خیموں سے باہر نکل کر عباسؑ کے علم پہ نظریں جمائے کھڑے ہیں ۔ تھوڑی دیر بعد علمدار حسینؑ نہر کے اندر پہنچ گیا ۔

صاحبانِ ذوق !

بتاؤ ۔ ایک آدمی تین دن کا پیاسا ہو ، گرمی کا موسم ہو ، اور بیس ہزار آدمیوں سے لڑ کر جب نہر میں پہنچا ہو تو اس کی پیاس اپنے پورے شباب پہ ہوگی یا نہیں ؟ یقیناً پانی کو دیکھ کر پیاس کی شدت بڑھ چکی ہوگی ———— مگر دنیا نے یہ منظر دیکھا کہ عباسؑ نے جھک کے مشک بھری ۔ تسمہ باندھا اور اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو بھیگ چکے لہٰذا ہاتھوں کو لوہے کی زرہ

سے صاف کیا اور دونوں ہاتھ اُٹھا کے دُعا کی۔

"خداوندا! میری انگلیاں حسینؑ کے بغیر بھیگ گئی ہیں جو "وفا" کے خلاف ہے۔ لہٰذا اب جو میرا اور حسینؑ کا سامنا ہو تو یہ ہاتھ میرے ساتھ نہ ہوں"

بزرگانِ من!

عباسؑ کی یہ ادا دیکھ کر کائنات جھوم اُٹھی اور چشمِ فلک نے ستاروں کی عینک لگا کر اس منظر کو دیکھا۔ چاروں طرف سے "سبحان اللہ، سبحان اللہ" کی صدائیں بلند ہونے لگیں کیونکہ ساری دنیا کی تاریخ ایک طرف ہے اور یہ واقعہ ایک طرف ہے۔ لہٰذا آج میں جناب امیرؑ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

"یا علیؑ! خیبر کا اکھاڑنا" ایک طرف ہے، "مرحب" کا پچھاڑنا ایک طرف ہے، "بسترِ رسولؐ" پہ سونا ایک طرف ہے۔ مگر

"اپنی پیاس میں دریا سے پیاسہ نکل آنا اور بات ہے"

بھائیو!

یہ مثال کہیں اور ملتی ہو تو بتاؤ؟۔ بہر نوع عباسؑ غازی پیاسے نہر سے نکل آئے اور خیموں کی طرف بڑھنے لگے اِدھر سکینہ نے چچا کو آتے جو دیکھا تو بلند آواز میں کہا۔

"بچو! وہ دیکھو میرے چچا پانی لیکر آ رہے ہیں"

چنانچہ بچے ایڑھیاں اُبھار اُبھار کر علم کو دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد زینبؑ نے دیکھا کہ علم کبھی داہنے جھکتا ہے۔ اور کبھی بائیں جھکتا ہے۔ اب جو علم کو اس طرح ڈگمگاتے دیکھا تو زینبؑ نے آواز دی۔

۔حسینؑ ! علم کو کیا ہو گیا؟"

حسینؑ نے وہیں سے آواز دی۔

" زینبؑ ! دیکھ تو میں بھی رہا ہوں مگر میری کمر ٹوٹ گئی۔ مجھ میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں وہاں جاسکوں"

عزاء دار سید الشہداؑ !

تھوڑی دیر بعد حسینؑ لاشے پہ پہنچے۔ اور خالی علم لیکر گھر واپس آگئے ادھر بچوں نے جو خالی علم دیکھا تو ان کے ہاتھوں سے خالی کوزے گر پڑے سکینہؑ نے کہا۔

" بچو ! مجھے معاف کرنا۔ میں نے جس بھروسے پہ کہا تھا وہ ختم ہو گیا۔"

اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّد ؐ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شجرہ طیبہ

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمدؐ و آل محمدؐ پر
درود و سلام

محترم سامعین!

اللہ نے انسان کے اندر بہت سی طاقتیں ودیعت کی ہیں، یہ تمام خلائی اور فضائی طاقتیں انسان کے تابع فرمان ہیں۔ گویا انسان اتنا طاقتور ہے نہ اور بے طاقت اتنا ہے کہ ذرا سا ٹمپریچر بڑھ جائے تو بے کار ہو گیا۔ اگر معمولی سا سر میں درد ہو گیا تو معطل ہو گیا۔ نڈر اتنا کہ نا ڈرنے پہ آئے تو چاند پہ پہنچ جائے اور ڈرپوک اتنا کہ، سانپ کے قریب سے گذرے تو چیخ نکل جائے۔ گویا نہ ہی اس کے ڈرپوک ہونے کی کوئی حد ہے۔ بہر نوع انسان جیسی طاقتور شے نے کس طرح گوارا کر لیا کہ وہ پتھر کو پوجنا شروع کر دے۔ اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے بیٹھا رہے۔

نوجوانو! زمانۂ جاہلیت کی بات نہیں ہے بلکہ آج کل کے پڑھے لکھے دور میں بھی ایسا ہو رہا ہے۔ آج کے تہذیب و تعلیم اور ترقی کے زمانہ میں کروڑہا انسان ایسے ہیں جو پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑ کے بیٹھے ہیں۔

سامعین!

اگر تم میری اس بات کی دلیل چاہتے ہو تو اپنے ہمسایہ ملک (بھارت) میں جا کے دیکھ لو کروڑ لوگ اگر اسمبلی میں تقریر کریں تو دنیا بھر کو حیران کر دیں

سیاسی باتیں کریں تو دنیا کا مزاج چکرا دیں اور اگر گھر جائیں تو پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے رہیں۔

ہم پوچھتے ہیں۔ پنڈت جی! کیوں اس پتھر نامراد کو پوج رہے ہو؟

پنڈت جی پورے فلسفیانہ انداز میں جواب دیتے ہیں کہ:۔

"مسلمانو! تم نے سمجھا ہی نہیں۔ کون کہتا ہے کہ ہم پتھر کو پوجتے ہیں"

ہم نے عرض کی:

پنڈت جی! ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم پوج رہے ہو اس میں کھلنے کی کیا بات ہے۔ اور اگر ہم نہیں سمجھے تو آپ ہی سمجھا دیں"۔

پنڈت جی کہتے ہیں۔

"اصل بات یہ ہے کہ میں گناہ گار ہوں اور میرا اللہ جو ہے وہ پرماتما ہے "پراکشور" ہے۔ اور یہ بت میرا اللہ نہیں ہے اور چونکہ میں ایک گناہ گار ہونے کی حیثیت سے اللہ کے حضور میں جانے سے شرماتا ہوں اس لئے اس بے گناہ کو میں نے اپنے اور اللہ کے درمیان "وسیلہ" بنایا ہے۔

ہم نے پوچھا "پنڈت جی! اس پتھر کو کیوں وسیلہ بنایا ہے؟"

پنڈت جی نے کہا۔

"دیکھو نا۔ خواہ میں کتنا ہی بڑا گناہ گار سہی مگر یہ پتھر بے گناہ ہے"

سامعین!

پنڈت کی بات سن کر میں بھی قائل ہو گیا کہ گناہ گار کو وسیلہ بنانے

سے پتھر پوجنا ہی بہتر ہے۔ کم از کم اس میں شعور کی بات تو ہے عقل کی بات تو ہے۔

پھر نوعِ انسان پتھر کو پوجنے لگا جو انسان کے بے عقل ہونے کی آخری منزل ہے۔

اب بتاؤ! یہ قانونِ عدل کی توہین ہے یا نہیں

کہ پتھر اللہ کی جگہ پر پہنچ گیا اور انسان پتھر کا بندہ ہو گیا۔ یہ انتہائی ظلم ہے یا نہیں کہ حقیقی معبود کو چھوڑ کر پتھر کو خدا بنا لیا۔ یہ قانونِ عدل کے انتہائی خلاف ہے یا نہیں کہ انسان پتھر کا بندہ بن گیا؟

صاحبان!

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے پتھر کو خدا کیوں بنا لیا؟

اس کا جواب یہی ہے کہ انسان فطرتاً "ٹوکنے والے" سے بھاگتا ہے اور "نا ٹوکنے والے" سے محبت کرتا ہے۔ ادھر اللہ چونکہ ٹوکتا بہت ہے کہ نماز کیوں نہیں پڑھی، روزہ کیوں نہیں رکھا، فلاں کا حق کیوں غضب کیا، فلاں سے فریب کیوں کیا؟ اس لئے انسان نے سوچا کہ "ٹوکنے والے" اللہ کو چھوڑ کر اسی "نا ٹوکنے والے" پتھر کو پوجو جو ٹوکتا ہی نہ ہو۔ توڑ دو تو بُرا نہیں کہتے۔ اور پوج لو تو شاباش نہیں کہتے۔ جہاں بٹھاؤ وہیں بیٹھ جائیں گے۔ کعبہ میں بٹھاؤ بیٹھ جائیں گے اور مندر میں بٹھاؤ بیٹھ جائیں گے غرض نہ ہی ان خداؤں کو اپنی حیثیت کا علم ہے اور نہ ہی اپنی جگہوں کا پتہ ہے کہ ہمیں یہاں بیٹھنا چاہیئے یا نہیں۔ ہر حالت میں لوگوں کے محتاج ہیں کہ انہوں نے جہاں چاہا انہیں بٹھا دیا۔

سامعین! ایک دن عالمِ تصور میں میں نے ان "نا ٹوکنے والے" خداؤں

سے گفتگو کر رہا تھا۔

"انسانوں کے بنائے ہوئے خداؤ! کعبہ میں کیوں بیٹھ گئے۔ یہاں تمہاری جگہ تھوڑی ہے!"

بتوں نے جواب دیا:۔

حضور! ہم خود تھوڑا ہی آئے ہیں۔ لوگوں نے بٹھایا۔ ہم بیٹھ گئے۔ تم ہمیں کیوں خواہ مخواہ کے لئے جھڑک رہے ہو؟"

ہم نے پوچھا۔

"پھر نکلتے کیوں نہیں ہو؟"

بتوں نے کہا:۔

صاحب! نہ خود آئے ہیں اور نہ ہی خود جائیں گے۔ لوگوں نے بٹھایا ہے۔ بیٹھ گئے اور جب کوئی نکال دے گا چلے جائیں گے"

ہم نے کہا۔

"بتو! تم جو یہاں بیٹھے ہو۔ تم میں کوئی کمال بھی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا:۔

"صاحب! ویسے ہم ہیں پتھر مگر ایک کمال ہے ہم میں کہ اگر جنگ ہو رہی ہو۔ بم سے بم برس رہے ہوں۔ ٹینک سے ٹینک ٹکرا رہے ہوں اور دُنیا پہ تباہی آ رہی ہو تو تم ہمیں پتھر کے بتوں کو میدان جنگ میں لے جاؤ اور جا کے رکھ دو تو ہم چورا چورا ہو جائیں گے پس جائیں گے تباہ ہو جائیں گے مگر میدان چھوڑ کر واپس نہیں آئیں گے۔ ہماری اسی ادا پہ دُنیا مرتی ہے"

بہر نوع انسان کے بنائے ہوئے یہ خدا نہ تو کسی کو ٹوکتے ہیں اور نہ ہی

کسی پر ظلم کرتے ہیں۔ مگر انسان نے سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ خدا کی جگہ پتھر کو پوجا اور یہ اس لئے کہ خدا ٹوٹتا ہے اور پتھر ٹوٹتا نہیں ہے۔ اور فطرتاً انسان مانوس ہوتا ہے "نا ٹوٹنے والے" سے اور بچتا ہے "ٹوٹنے والے" سے تو یاد رکھو! انسان کی جب دس میں پشتیں "نا ٹوٹنے" والے خدا کو پوجتی رہیں تو جب دو ایسی چیزیں اس کے سامنے آئیں گی۔ ایک ہو "ٹوٹنے والا" اور ایک ہو "نا ٹوٹنے والی" تو بت پرستی کی عادت یہ کہلوا دے گی کہ ہمیں نا ٹوٹنے والی "کافی ہے۔

محترم بزرگو!

انسان نے یہ خلافِ عدل حرکت کی کہ خدا کو چھوڑ کر بتوں کو پوجا اور یہ صرف اس لئے کہ اس کے مزاج میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ "نا ٹوٹنے والے" کو پسند کرتا ہے اور "ٹوٹنے والے" کو ناپسند کرتا ہے ورنہ کوئی احمق ایسا نہیں ہے جو بسلامتیٔ ہوش و حواس، انسان ہوتے ہوئے پتھر کو کہے کہ "تو خدا ہے"

ایک چیز اور ہے جس کی انسان نے ضد کی ہے کہ یہ جو شے بناتا ہے اسکی قدر بہت کرتا ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے مجسمہ تراشا اور پھر اس کی عزت اتنی کی کہ دنیا سے پوجوا دیا۔ گویا ہر بنانے والے کو اس کی عزت کا بڑا خیال ہوتا ہے۔ جو جسکو بناتا ہے وہ چاہتا ہے اس کی عزت بنے۔ جس شے کو بندے بنائیں۔ وہ چاہتے ہیں اس کی عزت بنے۔ اور جسے اللہ بنائے وہ چاہتا ہے اس کی عزت بنے۔ بہر نوع ہر بنانے والے کو اپنے بنائے ہوئے کی عزت کا پاس ہوتا ہے ورنہ اگر انسان میں ذرا سا عقل شعور ہو تو وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ فلاں چیز کہاں ہونی چاہیئے۔ پتھر کہاں

ہونا چاہیئے۔ حیوان کہاں ہونا چاہیئے اور انسان کہاں ہونا چاہیئے، گویا "چاہیئے" ہی کا نبھانا عین عدل ہے اور یہی اصل عقل ہے۔

سامعین!

ایک حدیث سنو کہ کون سی شے کہاں ہونی چاہیئے۔

ایک روز حضور سرورِ کائنات مسجد میں تشریف فرما ہیں اور صحابہؓ کبار کا مجمع سامنے ہے اور کتنی ہے متبرک وہ محفل جس میں ذاکر ہو رسولؐ اور سامعین ہوں اصحاب رسولؐ۔ اور کتنی نورانی ہیں وہ آنکھیں جنہوں نے نورِ جمال سے رسولؐ کو دیکھا اور کتنے معتبر ہیں وہ ہاتھ جنہوں نے خلوص و ایمان کے ساتھ رسولؐ کے ہاتھ پہ بیعت کی اور کتنے مبارک ہیں وہ قدم جو سلامتیٔ ایمان کے ساتھ چل کر رسولؐ کے پاس آئے۔ بہر نوع اصحابؓ رسولؐ سامعین ہیں اور رسولؐ واعظ ہیں اور اسی وعظ کے دوران رسولؐ فرماتے ہیں

"اللہ نے ایک شجرۂ طیبہ پیدا کیا ہے جس کی مثال کلمہ طیبہ جیسی ہے اور وہ شجرہ ایسا ہے کہ اس کی جڑ تو زمین میں گڑی ہوئی ہے اور اس کی شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہے"

بزرگانِ محترم!

رسولؐ کی یہ بات سنکر تمام سامعین سوچنے لگے کہ ایسا شجرہ طیبہ کہاں ہے جس کی جڑ تو زمین میں ہو اور شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہو۔

سب نے کہا:۔

"حضور! ذرا اس درخت کی تشریح فرما دیجئے"

رسولؐ نے فرمایا:۔

"تشریح میں بتاتا ہوں مگر اپنی عقل کے مطابق
اسے یاد رکھنا تمہارا ذمّہ ہے۔
دیکھو!
وہ "شجرہ طیبہ" جس کی جڑ زمین میں ہے۔ اور
شاخ آسمان میں ہے۔ وہ شجرہ طیبہ، ہم ہیں
میں اس شجرہ
طیبہ کی جڑ ہوں اور علیؑ اس کی شاخ ہیں"
اصحابؓ نے عرض کی۔
"حضور! ہمارا بھی اس شجرہ طیبہ سے کوئی تعلق ہے!"
رسولؐ نے فرمایا!۔
"ہاں۔ میرے ماننے والے اس شجرہ طیبہ کے پتے ہیں۔
سامعین!
چشم بد دور۔ آپ حضرات اس شجرہ طیبہ کے پتے ہیں بشرطیکہ ماننے
والے ہوں تارک "پتے باز" ہوں۔ بہر نوع آپ حضرات اس شجرہ طیبہ
کے پتے ہیں۔
اب ذرا قانونِ عدل کے مطابق سوچو کر اس درخت کی "جڑ"
کہاں ہونی چاہیئے۔ "شاخ" کہاں ہونی چاہیئے۔ اور "پتے" کہاں ہونے
چاہئیں۔
دیکھو نا!
کسی درخت کو آپ نے دیکھا ہے کہ اس کے پتے، جڑ سے چمٹے ہوئے
ہوں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ پتے ہمیشہ شاخ کا دامن پکڑے رہتے ہیں۔ حالانکہ

حالانکہ پتّے زندہ ہی جڑ کی بدولت ہیں۔ انہیں خوراک ہی جڑ کی بدولت پہنچتی ہے۔ اگر پتوں کا تعلق جڑ سے منقطع ہو جائے تو ختم ہو جائیں کیونکہ پتوں کا جڑ سے تعلق اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک "شاخ" کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں اور شاخ کے توسط سے جڑ سے فیض پہنچے گا۔ گویا پتوں کے لئے یہ قانونِ عدل ہے کہ شاخ کا دامن نہ چھوڑنے پائیں۔

سامعین!

اب اگر کوئی "مغرور و متکبر پتّہ" دل میں یہ خیال کرے کہ جب جڑ موجود ہے تو جڑ کے ہوتے ہوئے شاخ کا احسان کیوں اٹھایا جائے لہٰذا شاخ کو چھوڑ کر جڑ کی گود میں آ بیٹھے۔ گھنٹہ دو گھنٹے تو خیریت سے گذر جائیں گے۔ پھر کیا ہو گا رنگ زرد ہو جائے گا، رگیں پھول جائیں گی حیات رخصت ہو جائے گی، زندگی وبال ہو جائے گی، موت طاری ہو جائے گی، شکل بے شکل ہو جائے گی اور ہوا کے جھونکے اِدھر سے اُدھر اڑاتے جائیں گے۔ اور اگر ایک دو دن ضد کر کے جڑ کے پاس ہی بیٹھے رہے تو کوئی "تنور" والا آئے گا اور ان تمام پتوں کو جو شاخ کا دامن چھوڑ کر جڑ کے پاس بیٹھے رہے، انہیں اٹھا کر لے جائے گا۔ اور آگ میں ڈال دے گا۔ گویا ہر اس پتے کو جو شاخ کا دامن چھوڑ دے گا، انجام میں آگ میں جلنا پڑے گا۔ اگر شاخ کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر رکھتا تو کیا مجال تھی کہ اس کا یہ انجام ہوتا۔ پوری آب و تاب کے ساتھ حیات بھی برقرار رہتی اور ہوا کے جھونکے کے ساتھ شاخ کے ساتھ جھولتا بھی رہتا بہر نوع پتے کے لئے قانونِ عدل یہی ہے کہ وہ شاخ کے ساتھ وابستہ رہنے اور پھر شجرۂ طیبہ کی شاخیں! سبحان اللہ۔ اگر کسی کو ان سے

وابستگی ہو جائے تو اس سے بہتر کوئی ہے ہی نہیں۔ کتنا خوش نصیب ہوگا، وہ انسان جس کا تعلق آلِ رسولؐ سے ہو جائے اور یہی قانونِ عدل ہے۔

محترم بزرگو!

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات سے بہتر قانون عدل کو کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ حضورؐ بہتر جانتے تھے کہ کس کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہیئے۔ کس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ لہٰذا رسولؐ نے ہر اچھے آدمی کا احترام کیا، ہر اچھے آدمی کی عزت کی ہر شریف آدمی کا وقار ملحوظ رکھا مگر کسی کتاب میں، کسی تاریخ میں، کسی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ حضورؐ سیّدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا کے علاوہ رسولؐ کسی کی تعظیم کو اُٹھے ہوں بخاری شریف میں تو یہ ہے کہ "جب سیّدہ تشریف لاتی تھیں تو رسولؐ فوراً تعظیم کو بھی اُٹھتے تھے اور جہاں خود بیٹھتے تھے وہاں سیّدہ کو بھی بٹھاتے تھے اور خود سامنے بیٹھ جاتے تھے۔

اَب بتاؤ!

رسولؐ نے اتنا احترام کسی اور کا کیا ہوگا، ہرگز نہیں۔

معلوم ہوا کہ قانونِ عدل کے مطابق سیّدہ اس احترام کی مستحق تھیں تو رسولؐ نے بھی اتنا احترام کیا۔ ورنہ رسولؐ سے بہتر قانونِ عدل کو کون جانتا ہے۔

اب بتاؤ! جس خاتون کی زندگی بھر یہ عادت ہو گئی ہو کہ جس کے احترام کو رسولؐ اُٹھتا ہو تو کیا اس کی فطرت میں یہ داخل نہیں ہو گیا کہ وہ جہاں جائے اس کی تعظیم کی جائے۔ اور کیا وہ خاتون یہ برداشت کر سکتی ہے جس کی تعظیم محمدؐ کرتے ہوں کہ آج اسے کوئی یہ کہدے کہ تم "غلط

کہہ رہی ہو"؟

محترم سامعین!

سیدۂ طاہرا سلام اللہ علیہا ہی کے صدقہ میں قیامت کے دن ہماری شفاعت و نجات ہوگی۔ ہوسکتا ہے نجات کے وقت ہماری نماز و روزہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا عوض بن جائے اور بخشش کے لیئے کوئی شئے باقی نہ رہے۔ لہٰذا سوائے نظرِ کرم حضور سیدہ طاہرا ہماری شفاعت ناممکن ہے۔

حضور والا!

رسالتؐ مآب نے فرمایا ہے کہ قیامت کے میدان میں ساری روئے زمین کا انسان موجود ہوگا۔ ان میں انبیاءؑ، اولیاءؒ، اصفیاء غرض ہر قسم کا انسان موجود ہوگا۔ اور ہر شخص اپنے اعمال کے اچھا یا بُرا ہونے میں مبتلا ہوگا۔ اس وقت ایک غیبی آواز آئے گی۔

"قیامت والو! جہاں جہاں کھڑے ہو آنکھیں بند کرلو۔ سر جھکالو"

لہٰذا تمام انبیاء و اولیاء سمیت ہر انسان اپنی آنکھیں بند کریگا سر جھکالیں گے۔ اور چھپکے چھپکے ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔

"بات کیا ہے۔ سر کیوں جھکایا گیا؟"

چنانچہ تمام انبیاءؑ کا سردار (آدمؑ) انہیں بتائے گا کہ آنکھیں اس لیئے بند کروائی گئی ہیں اور سر اس لیئے جھکائے گئے ہیں کہ محمدؐ کی بیٹی سیدہؑ کی سواری گذر رہی ہے"

اس شان سے سیدہؑ کی سواری آئے گی۔ قیامت میں درود و سلام

کے نعرے بلند ہو جائیں گے۔ سب سر جھکائے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے اور سیدہ کی سواری اس شان سے میدانِ قیامت سے گذرے گی اور جب عرش الٰہی تک پہنچے گی تو وہاں سیدہ فرمائے گی۔

"خداوندا! میں نے آج تک صبر کیا۔ آج قیامت کا دن ہے۔ آج میں تیری عدالت میں اپنا دعویٰ پیش کرنے آئی ہوں۔ خداوندا! اگر کسی کے گھر قتل ہو جائے تو اس قتل کی مدعی حکومت بن جاتی ہے۔ آج میں تیری حکومت سے فریاد کرنے آئی ہوں۔ کہ میرے گھر میں ایک دن میں بہتّر قتل ہو گئے جنکی فریاد کرنے آئی ہوں"

سامعین:

جب سیدہ اپنا مقدمہ پیش کر دے گی کہ میرے گھر میں ایک دن میں بہتّر قتل ہو گئے تو عدالت الٰہی سے پر جوش خطاب ہو گا۔

"سیدہ! ہمیں پتہ ہے، ہم آئینی گواہ ہیں مگر مثل کو مکمل کرنے کے لئے تمہارے پاس کوئی آئینی گواہ موجود ہے تاکہ اسے عدالت میں بلا لیا جائے"

سیدہ طاہرا فرمائیں گی۔

"خداوندا! اگر چشم دید گواہ چاہیئے تو میری بیٹی زینب موجود ہے"

بس بھائیو! قدرت کی طرف سے حورانِ جنت کو حکم ہو گا کہ زینب کو بڑے احترام کے ساتھ عدالت الٰہی میں لایا جائے تاکہ وہ اپنی ماں کے مقدمہ میں گواہی دے سکے" چنانچہ حورانِ جنت شام جائیں گی اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر عرض کریں گی۔

"خداوندا ! زینبؑ کے حضور گئے تھے مگر انھوں نے فرمایا کہ میں اسی طرح قیامت میں آنا چاہتی ہوں جس طرح کوفہ و شام کے بازار میں گئی تھی"

بہر نوع زینبؑ کی قیامت میں آمد ہو گی۔ زین العابدینؑ مہار پکڑے ہوئے زینبؑ ننگے سر اونٹ پہ سوار۔ اور قدرت کی طرف سے ارشاد ہو گا۔

"زینبؑ ! بتاؤ۔ کربلا میں کیا گذری کیونکہ تم چشم دید گواہ ہو"

زینبؑ ماں سے کہے گی :۔

"اماں ! تو نے مرتے دم مجھ سے وصیت کی تھی کہ بھائیوں کا خیال رکھنا۔

اماں ! میں نے تیری اولاد پہ اس وقت تک حرف نہیں آنے دیا جب تک اپنی نسل ختم نہیں کروا دی۔

اماں ! تیرا حسینؑ بھی کربلا میں تھا۔ میں بھی کربلا میں تھی۔ لہٰذا میں نے سارے کام حسینؑ کے ساتھ بانٹ رکھے تھے۔ آدھا کام حسینؑ کرتے تھے اور آدھا کام میں کرتی تھی مگر فرق یہ تھا، وہ مرد تھے۔ میں خاتون تھی۔ مردوں کے کام حسینؑ کے سپرد تھے اور خواتین کے کام میرے سپرد تھے۔ اماں ! میں نے حسینؑ سے تقسیم کر رکھی تھی کہ :۔

حسینؑ! گھر سے باہر کے کام تیرے سپرد اور گھر سے اندر کے کام میرے سپرد، باہر سے لاشہ لانا تیری سپرد اور اس لاش پہ بیٹھ کے رونا میرے حصہ میں۔
شہیدوں کی سرداری حسینؑ! تم کرنا اور اسیروں کی گریازاری میں کروں گی۔
حسینؑ! کفن نہ ملنا تمہارا حصّہ اور چادر نہ ملنا میرا حصّہ۔
حسینؑ! قبر نہ ملنا تمہارا حصّہ اور در بدر پھرنا میرا حصّہ۔
حسینؑ! تم مرد ہو، میں خاتون ہوں۔ جتنے کربلا میں لڑکے ہیں وہ تمہاری سپرد اور جتنی لڑکیاں ہیں وہ میری سپرد۔
حسینؑ! علیؑ اصغر لڑکا ہے وہ تیری سپرد اور سکینہ لڑکی ہے وہ میری سپرد
حسینؑ! اصغرؑ کے گلے سے خون بہے گا تو تیری گود میں اور سکینہؑ کے کان زخمی ہوں گے تو میری گود میں
حسینؑ! تو ایک بھائی قربان کرے عبّاس جیسا، مگر دیکھ حسینؑ! میں دو بھائی قربان کروں گی ایک حسینؑ جیسا اور ایک عبّاس جیسا۔
حسینؑ! تو ایک بھتیجا قربان کرے گا قاسمؑ جیسا اور میں تین بھتیجے قربان کروں گی ایک اکبرؑ جیسا، ایک اصغرؑ جیسا اور ایک قاسمؑ جیسا

حسینؑ! تو دو بیٹے قربان کرے گا۔ ایک اکبرؑ جیسا اور ایک اصغرؑ جیسا۔ مگر
دیکھ حسینؑ! میں بھی دو بیٹے قربان کروں گی مگر میرے بیٹوں اور تیرے بیٹوں میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ میرے بیٹے کنیز زادے ہیں اور تیرے بیٹے شہزادے ہیں۔
مگر سن حسینؑ! تیرے دو بیٹے قربان ہونے کے بعد بھی تیری نسل قیامت تک باقی رہے گی اور میں اپنے دو بیٹے عونؑ و محمدؑ قربان کر کے اپنی پوری نسل قربان کر دوں گی۔
اب تیرا کوئی بیٹا مجھے اماں کہدے تو کہدے ورنہ میرا کوئی بیٹا نہیں رہے گا۔"

سامعین!

یہ کہہ کر زینبؑ ماں سے لپٹ گئی اور درد بھری آوازیں فرمانے لگی۔

"اماں! میں نے تیری اولاد پہ اپنی پوری نسل ختم کر دی۔ اماں! خدا گواہ ہے۔ اکبرؑ کی میّت پہ بال سفید ہو گئے مگر عونؑ و محمدؑ کے لاشوں پہ نہیں روئی۔
اماں! حسینؑ سے پوچھ لو، میں نے عونؑ و محمدؑ تیرے بیٹے پہ صدقہ کر دیئے تھے۔

اللہ ہماری مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصوّرِ آلِ محمدؐ

خداوندعالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ پہ درود و سلام

معزز سامعین!

آج میں اپنے ایک عزیز کے عقد کے سلسلہ میں حاضر ہُوا ہوں۔ لہٰذا آج کی یہ مجلس بغرض حصولِ برکت وسعادت منعقد کی جارہی ہے۔ کیونکہ یہ نکاح سادات کے دُو خاندانوں کے درمیان میں ہے اور دُنیا کی یہ رسم ہے کہ وہ اپنی تقریب کو زیادہ سے زیادہ باعزت اور بااحترام بنانے کے لیے بڑے سے بڑے آدمیوں کو بلاتے ہیں جنہیں وہ بلا سکتے ہوں تاکہ یہ یادگار رہے کہ فلاں تقریب میں فلاں بزرگ تشریف لائے تھے۔ بہرلوح ہر آدمی کا یہ جی چاہتا ہے کہ کوئی بڑی ہستی تقریب میں شریک ہو۔

لہٰذا سادات کا دِل بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی اپنی تقریب میں بڑی سے بڑی ہستیوں کو بلائیں چنانچہ یہ سیدہ زادے تمام کائنات پہ نظر ڈالتے ہیں کہ بڑی سے بڑی ہستی کون ہے جسے ہم بلائیں۔ جب چاروں طرف نظریں اُٹھتی ہیں تو سادات کو اپنے سے بڑی ہستی نظر ہی نہیں آتی۔ لہٰذا اب ہم سوچتے ہیں کہ اپنے ہی بزرگوں میں سے کسی کو بلالیں تاکہ ہماری یہ تقریب بابرکت ہو جائے مگر اتفاق سے اِدھر ان کو بزرگ ایسے مل گئے کہ یہ تو اِن کی اولاد ہُوئے۔ مگر وہ تو خدا کے گھر بھی بِن بلائے نہیں جاتے بلکہ بلانے سے جانا تو اور بات ہے قرآن میں تو یہ ہے کہ۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ: "پاک ہے وہ ذات

جو اپنے بندے کو آکرے گی "

گویا اتنے نازک مزاج اور اعلیٰ قدر بزرگ ہیں جو خدا کے پاس بھی بن بلائے نہیں جاتے بلکہ خدا کی ذات خود آکر انہیں لے جاتی ہے۔

بہر نوع سیّد زادے یہ سوچ رہے ہیں کہ ہم انھیں کیسے تکلیف دیں تاکہ وہ ہماری محفل میں شریک ہوں۔ آخر ہم مولوی صاحبان کے پاس پہنچے اور عرض کی

"مولانا! ہم اپنے بزرگوں کو خوشی کی تقریب میں بلانا چاھتے ھیں۔ بتایئے! کس طرح بلائیں۔

مولوی صاحبان فرماتے ہیں:۔

تمہارا خیال غلط ہے۔ اگر دس بیس جگہ شادی ھوئی اور سب سیدوں نے بلایا تو وہ بیچارے کہاں کہاں جائیں گے۔ کیوں خواہ مخواہ کے لئے بزرگوں کو تکلیف دیتے ہو لہٰذا یہ ارادہ ھی مت کرو"

میں کہتا ہوں۔

"مولانا! دس بیس جگہ کی بات کیا ہے۔ اگر دس کروڑ جگہ بھی بیک وقت انہیں بلایا جائے تو وہ ہر جگہ جائیں گے۔ کیونکہ جگہ اور مکان ان کے لئے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ مکانوں کی قید میں وہ جسم رہتے ہیں جو ہمیشہ مکان تک ہی محدود رہے ہوں۔ اور جو انسان لامکان کی سیر کر آئے ہوں، انہیں مکان کی قید نہیں رہتی لہٰذا وہ ہر جگہ بیک وقت تشریف لاتے ہیں۔

سامعین!

بات سے بات نکلی ہے۔ دیکھو نا! ہم یہاں امام باڑہ میں بیٹھے ہوئے

ہیں۔ سورج سر پہ آگیا۔ دھوپ لگنے لگے۔ ہم یہاں سے اٹھ کر کسی دوسرے امام بارہ میں پہنچے مگر وہاں بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ سورج سر پہ آگیا۔ اس کے بعد کسی اور جگہ پہنچے تو وہاں بھی یہی کہا جارہا ہے کہ سورج سر پہ آگیا۔ ایک ہی سورج ہے اور کروڑہا انسان بیک وقت کہہ رہے ہیں کہ ہمارے سر پہ آگیا حالانکہ سورج وہیں ہے جہاں ہے۔

گویا جب معمولی سی نور کی کرنوں کو پہنچانے والا نور بیک وقت کروڑہا جگہ ہونے کے باوجود اپنی جگہ رہتا ہے تو اس نور کو نور عطا کرنے والے "نوروں" کے لئے کوئی بے نور آنکھ ہی ہوگی جو کہہ دے گی کہ یہاں کیسے اور وہاں کیسے۔؟

بہر نوع وہ مجسم نور بیک وقت ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں جگہ تشریف لا سکتے ہیں۔ اگر انہیں تصوّر کرو تو وہ دل میں خیال بن کے آجاتے ہیں۔ اور اگر ان کے مصائب سنو تو قلب میں ملال بن کے آجاتے اور اگر ان کی حالتِ غضب دیکھو تو انسان کے چہرے پہ جلال بن کے آجاتے ہیں اور کہیں محمّد کو پکارو تو وہ اس کے ساتھ اس کی آل بن کے آجاتے ہیں۔ غرض وہ ہر وقت آنے کے لئے تیار ہیں مگر ذرا کوئی انہیں بلا کے تو دیکھے۔ وہ ضرور تشریف لاتے ہیں۔ مگر ان کے بلانے کا طریقہ یہ ہے کہ

ایک دن ایک عقیدت مند حضورؑ امام زین العابدینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی۔

۔ فرزند رسولؐ! حضور کے غلام زادے کی شادی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حضور بھی اس میں تشریف لائیے۔ تاکہ میری یہ تقریب با برکت ہوجائے۔!

امامؑ نے فرمایا۔

"بھائی! انکار کرتے ہوئے شرم آتی ہے کیونکہ تو بڑی محبت سے آیا ہے مگر میں کیا بتاؤں کہ میں نے سانحہ کربلا کے بعد خوشی کی تقریبوں میں شرکت بند کر دی ہے"

یہ سنکر وہ عقیدت مند بولا۔

"حضورؑ! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے حضورؑ کو دعوت دے کر اذیّت پہنچائی ہے"

امامؑ نے فرمایا:

"کوئی بات نہیں۔ خدا تیرے بچے کو پروان چڑھائے اللہ تیری نسل کو بڑھائے"

وہ شخص خاموش ہو گیا۔ اور جب جانے لگا تو امامؑ نے فرمایا۔

"بھائی عرب! ٹھہر جا۔ دل تھوڑا نہ کر۔ میں تیری تقریب میں ضرور آؤں گا۔ مگر ایسا کر کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے باباؑ کی مجلس بھی کرلے۔ میں مجلس میں آجاؤں گا اور تیرے ہاں شرکت بھی ہو جائے گی"

بزرگانِ من!

امام زین العابدینؑ کے اس فرمان کی روشنی میں ہر سیدہ زادہ اپنی خوشی کی تقریب میں اس لئے مجلسِ عزا منعقد کرتا ہے تاکہ محمدؐ و آلِ محمدؐ ان موقعوں پر تشریف لائیں اور یہ تقریب بابرکت ہو جائے۔ لہٰذا آج ہم پورے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ آج ہماری اس تقریب میں وہ آئے ہیں جن کے گھر قرآن آیا ہے۔ جن کے گھر نبوت آئی ہے جنکے

گھر امامت آئی ہے۔ جن کے گھر شہادت آئی ہے۔ جن کے گھر عصمت آئی ہے۔ جن کے گھر صداقت آئی ہے۔ جن کے گھر امانت آئی ہے جن کے گھر ھدایت آئی ہے۔ جن کے گھر فرشتے خادم بن کے آئے ہیں

گویا آج ہم اعلان کرتے ہیں کہ ؎

"جبرائیل بہ ملائک درباں شد است"

آج ھمارا دروازہ معمولی نہیں ہے بلکہ جبرئیل تمام فرشتوں کے ساتھ آج ھمارے گھر کی دربانی کر رہے ھیں۔

بہرکیف آج ہماری اس تقریب میں حضرات محمد و آل محمد تشریف فرما ہیں۔ وہ یہاں آکر ہمارے عشق کا امتحان لیتے ہیں کہ تم نے تو ہمیں بلا لیا۔ اور ہم اللہ جانے کہاں سے چل کر آئے ہیں۔ (یہ غلط بات ہے کہ محمد و آلِ محمد جنت سے آتے ہیں)

دیکھو نا!

ایک دفعہ میں نے منبر پہ دو باتیں کہہ دیں تھی جس کی مجھے جواب دہی کرنی پڑی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ کسی نے پوچھا۔

"زیدی صاحب! حسینؑ نماز پڑھتے تھے؟"

میں نے کہا۔

"جھوٹ کہتے ہو۔ حسینؑ کو نماز پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ چونکہ حسینؑ کے صدقے میں نماز باقی رہ گئی۔ لہٰذا حسینؑ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ نماز حسینؑ کو پڑھتی تھی"

دوسری بات یہ تھی کہ کیا آلِ محمد جنت میں رہیں گے؟

میں نے کہا۔

"توبہ کرو۔" "آلِ محمدؐ" کیوں جنت میں جائیں کیونکہ جنّت تو ان کے اُدنیٰ غلاموں کے لئے بنی ہے۔ لہٰذا گورنمنٹ ہاؤس کہو اور سروینٹ کوارٹرز کہو۔ یہ تو سرونٹ کوارٹرز ہیں جن کا نام جنت ہے۔ خدا نہ کرے کہ آلِ محمدؐ جنت میں جائیں کیونکہ جنّت تو آلِ محمدؐ کے غلاموں کے رہنے کی جگہ ہے اور آلِ محمدؐ کے رہنے کی جگہ وہاں ہے جس جگہ کا ہم تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔

دیکھو نا!

جب ہمارا یہ ایمان ہے کہ آلِ محمدؐ دُنیا کی ہر شئے سے پہلے پیدا ہُوئے تھے۔ تو وہ جنت سے پہلے بھی پیدا ہوئے تھے۔ لہٰذا جب جنت نہیں تھی تو وہ کہاں رہتے تھے۔! بس جہاں رہتے تھے وہیں رہتے تھے۔ خدا نہ کرے کہ آلِ محمدؐ جنّت میں رہیں۔ جنت تو ہمارے لئے بنی ہے۔ جنّت تو آلِ محمدؐ کے غلاموں کے (SERVANT QUARTERS) ہیں۔ جو ان کے عمل کے قریب ہیں۔ انشاءاللہ ہم ان کوارٹرز میں جائیں گے۔ اور ہمارے کوارٹرز کی صفائی اور درستی کے لئے اللہ نے حوریں مقرر کی ہُوئی ہیں جن کا کام صرف اتنا ہے کہ ہمارے جانے سے پہلے وہ ہمارے مکانوں کو صاف ستھرا رکھیں اور جب ہم چلے جائیں گے تو ہم انہیں چھٹی دے دیں گے۔

گویا وہ "حوریں" ہمارے بھی (SERVANT QUARTERS) میں رہیں گی۔

بہر نوع آلِ محمّد جنت سے کہیں دُور سے تشریف لاتے ہیں۔ اور یہاں آکر وہ ہمارا امتحان لیتے ہیں۔ کہ

• ہمیں بلانے والے! تیری "شادی" مُبارک ہو۔ تیرا "سہرا" مُبارک ہو، تیرے گھر والے خوش رہیں، تیرے ماں باپ کے کلیجے ٹھنڈے رہیں تیرے بہن بھائی خوش رہیں، تیرے دوست احباب خوش رہیں۔ تو نے ہمیں بلایا ہے، تیرے دل میں ہماری محبت ہے ــــــــــــ مگر

اپنی خوشی میں تو ہمیں بھول تو نہیں گیا؟

ہم عرض کرتے ہیں:۔

• اے آلِ محمّد! ہم نہیں بھولے جب ہمارے ہاں "بیٹا" ہوتا ہے تو ہم اس کے کان میں اذان دینے سے پہلے تیرے "اصغرؑ" کو یاد کرتے ہیں۔ اور جب اپنے "جوان" کی شادی کرتے ہیں تو ہم تجھے بھولتے نہیں بلکہ اپنے جوانوں کو سینے سے لگا کر تیرے "اکبرؑ و قاسمؑ" کے سہرے کو یاد کرتے ہیں۔

اے آلِ محمّد!

ہم تمہاری خوشی اور غمی کو ہر وقت یاد رکھتے ہیں ہم کسی لمحہ کے لیے غافل

تمہاری یاد سے غافل نہیں ہوتے۔ ہمارا رونا بھی تمہارے لئے ہے اور ہمارا ہنسنا بھی تمہارے لئے ہے۔

اے رب العزت!

ہم بڑے کمزور اور نالائق گناہ گار ہیں اور دینِ محمدؐ کی امانت ہمارے پاس ہے۔ اس کی تو حفاظت فرما۔ ہمارے وارث کے ظہور میں تعجیل فرما کیونکہ دنیا نے ہمیں یتیم اور لاوارث سمجھ لیا ہے۔ لہٰذا ہم دنیا کو دکھا سکیں کہ ہم تنہا نہیں ہیں بلکہ ہمارا وارث علیہ السلام بھی موجود ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسیرِ بغداد

عزادارِ سید الشہدا!

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام عرصہ چودہ سال سے بنی عباسیہ کے حبیب تاجدار "ہارون رشید" کے دورِ ملوکیت میں تنگ و تاریک قید خانہ میں بند ہیں۔ اگر مولا کھڑے ہوتے ہیں تو قید خانہ کی چھت نیچی ہے اور اگر لیٹتے ہیں تو پاؤں نہیں پھیلتے۔ گویا اسی تنگ و تاریک کوٹھری میں فرزند رسولؐ قید ہیں۔ اِدھر ہارون رشید چاہتا یہ ہے کہ امامؑ شہید کر دیئے جائیں اور میرے ذمہ خون بھی بظاہر نہ ہو لہٰذا اس نے بہت سی تدبیر اختیار کیں۔ یہاں تک کہ افریقہ کے جنگلوں سے کچھ جنگلی آدمی جو یہ جانتے ہی نہ تھے کہ انسانیت کیا شے ہے، جانوروں کی طرح انہیں وہاں سے گرفتار کروا کے بغداد منگوایا گیا۔ انہیں شراب پلائی گئی اور جب وہ بالکل وحشی بن جاتے تو انہیں ایک ایک تلوار دے دی جاتی اور کہا جاتا کہ سامنے والی چارپائی پر پڑی ہوئی چادر کے نیچے والی لکڑی پر زور زور سے تلواریں مارو۔ گویا وہ اس طرح مشق کرتے رہے۔

جب چالیس دن گذر گئے تو ان کا محرک جو مشق کروا رہا تھا انہیں لیکر قید خانے میں پہنچ گیا۔ اِدھر امامؑ چادر اوڑھے ہوئے لیٹے ہوئے تھے ان وحشیوں کو شراب پلا کر تلواریں دی گئی تھیں۔ کیونکہ لکڑی پر تلواریں

مارنے کی انھیں عادت تو پہلے ہی سے تھی لہٰذا امامؑ کی طرف اشارہ کرکے کہا گیا کہ ان کے جسم پر تلواریں مارو۔ چنانچہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق تلواریں کھینچی اور اِدھر امامؑ نے اپنے منہ سے کپڑا اٹھایا۔ اب جو وحشیوں نے چہرۂ امامؑ دیکھا تو تلواریں پھینک کے امامؑ کے قدموں پہ گر گئے۔ اب جو رنگ ماسٹر نے یہ منظر دیکھا تو فوراً ہارون کے پاس پہنچا۔ اور کہنے لگا۔

,, ہارون! غضب ہوگیا۔ وہ وحشی بجائے قتل کرنے کے امامؑ کے قدموں پہ گر گئے ہیں،، چنانچہ ہارون نے انہیں بلوایا اور جب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ

,, ہم نے اُسے پہچان لیا ہے،،

ہارون پوچھتا ہے ,, وہ کون ہے؟،،

انھوں نے کہا ,, جب ہمارے جنگلوں میں بارش نہیں ہوتی تھی تو یہ انسان وہاں پہنچ کر بارش برساتا تھا،،

سامعین!

یہ ہے شانِ امامت۔ اگر دُنیا اس کو گھٹانا چاہے تو اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے جو کسی کے گھٹانے سے نہیں گھٹائی جاتی۔ یہ اور بات ہے کہ دُنیا والے آلِ محمدؐ کو قید خانوں میں مقید کر سکتے ہیں مگر آلِ محمدؐ وہی کریں گے جو اللہ چاہتا ہو۔ خدا کی مرضی و مشیت کے بغیر ان کا کوئی قول و فعل ان سے سرزد نہیں ہو سکتا۔

بہرنوع امام موسیٰ کاظمؑ اس قید خانہ میں قید ہیں اور اس قید خانے

کا داروغہ ابن شاہک لعین جو شمر لعین سے بھی بدتر تھا۔ اس کے ذریعے مولا کو ۲۳ رجب کو زہر دیا گیا۔ جب مولا کی حالت بہت خراب ہوگئی تو ہارون نے اس ڈر سے کہ کہیں لوگوں کو زہر کا پتہ نہ چل جائے۔ ایک عیسائی طبیب کو بلوا بھیجا کہ مولا کا معائنہ کرے اور یہ کہے کہ موت طبعی ہوئی۔ بہرکیف وہ طبیب آیا اب ابن شاہک لعین مولا سے کہتا ہے

"دیکھو! طبیب آرہا ہے۔ خبردار جو تم نے اس سے کہا کہ مجھے زہر دیا گیا ہے"

یہ کہہ کر وہ لعین وہیں بیٹھ گیا۔ طبیب پہنچا۔ مولا کا معائنہ کیا۔ مولا نے زبان سے کچھ نہ کہا البتہ اپنی ہتھیلیاں طبیب کے سامنے کر دیں۔ اب جو طبیب نے دیکھا تو چیخ ماری "ہائے۔ اس قیدی کو تو زہر دیا گیا ہے"

ادھر محافظ یہ سمجھ کر امامؑ نے خود بتا دیا ہے۔ چنانچہ قیدی امامؑ سے ایسا سلوک کیا گیا کہ دنیا کا یہ پہلا قیدی ہتھکڑی میں بندھے ہوئے ہاتھوں اور پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کے ساتھ قید حیات سے آزاد ہوگیا۔

جب امامؑ کی موت کی خبر ہارون کو پہنچی تو وہ ظالم کہتا ہے کہ چار مزدور لے جاؤ اور امامؑ کی لاش کو دفن نہ کرو بلکہ دجلہ کے پل پہ رکھ دو۔ تاکہ رات کے وقت خچر، گدھے اور گھوڑوں کے گذرنے سے لاش پامال ہو جائے گا تاکہ صبح ہم کہہ سکیں کہ قید سے فرار ہوگیا تھا اور راستے میں مارا گیا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تقریباً آدھی رات گذرنے کے بعد بیوپاریوں کا ایک قافلہ گزرا تو ان کے جتنے ہی جانور تھے جب پل کے قریب پہنچے تو رک گئے۔ لوگ بڑے حیران تھے کہ یہ جانور آگے کیوں نہیں چلتے۔ آخر انھوں نے دیکھا کہ پل پہ ایک قیدی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔

حضور والا!

بغداد میں ایک لوہار رہتا تھا۔ رات کو جب وہ سویا تو کسی نے اس کے دروازے کی کنڈی کھڑکائی۔ لوہار اپنے بستر سے اُٹھا دروازہ کھولا اور دیکھا کہ ایک برقعہ پوش خاتون سامنے کھڑی ہے جو اس سے یہ کہہ رہی ہے

"تو نے گذشتہ سال ایک منت مانی تھی کہ اگر خدا نے بیٹا عطا فرمایا تو میں فاطمہؑ کے کسی بیٹے کی خدمت کروں گا"

لوہار نے عرض کی۔

"ہاں بی بی! مجھے یاد ہے مگر تجھے کیسے پتہ چلا؟"

برقعہ پوش خاتون نے فرمایا۔

"میں ہی وہ بدنصیب فاطمہؑ ہوں"

بہر نوع لوہار سر جھکائے ہوئے خاتونِ عُلیا کے ساتھ ساتھ چل پڑا اور جب پل پر پہنچا تو بی بی نے عرض کی۔

"یہ ہے میرا بیٹا۔ اس کی ہتکڑی اور بیڑی اُتار دو"

لوہار نے بسم اللہ پڑھ کے امامؑ مظلوم کی ہتھکڑی اور بیڑی اتار دیں۔ اور بعد میں ایک قافلے نے غریبوں کے قبرستان میں امامؑ مظلوم کو دفن کر دیا۔

بزرگانِ من!

دنیا کی ستم ظریفی دیکھو کہ اگر یہاں کوئی پردیسی مرجائے تو چندہ کر کے لوگ اس کا کفن خریدیں گے اور نہایت شان سے اسے دفن کریں گے مگر آلِ محمدؐ کی بدنصیبی دیکھو کہ آج بغیر کفن کے غریبوں اور لاوارثوں

کے قبرستان میں فرزندِ رسُول دفن کر دیا گیا۔

یاد رکھو!

اِسے کہتے ہیں تصرّف امامت۔ ہارون و مامون کی قبر تک کے نشانات کہیں نہیں ملتے اور نہ ہی کوئی نشان بتانے والا ہے کہ کہاں دفن کئے گئے ہیں اِس لیے کہ زمین ہے "ابو ترابؑ" کی ما لکیت خدا جانے کہاں رہی مگر ذرا وہاں جا کر دیکھو جہاں دُنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ اپنے تاج ہاتھوں میں لیے، سر جھکائے ہوئے کھڑے ہیں۔ جہاں طوبیٰ کا سایہ ہے جہاں حوریں دست بستہ کھڑی ہیں۔ جہاں کوثر کا کنارہ ہے۔ جہاں جنت کی بہاریں ہیں۔ جہاں ایمان ملتا ہے اور جہاں اسلام کا تعارف ہوتا ہے۔

آج ہم اس مظلومؑ امام کی شہادت کا دِن منا رہے ہیں اور دُنیا بیٹھی رو رہی ہے۔

"بی بیؑ! تو لوہار کو بلانے گئی تھی اِس سے یہیں اندازہ ہوتا ہے کہ تمہیں اِس بیٹے کا بڑا درد تھا لہٰذا آج ہم نے تیری سُنّت کو پُورا کرنے کے لئے تیرے غلاموں کو بلایا ہے جو بغداد کے غریب کا ماتم کریں گے اور اسے روئیں گے

عزادارِ سیّد الشہداء!

میرا ایمان ہے کہ جب سیّدہ طاہرا سلام اللہ علیہا اپنے اس مظلوم بیٹے کی صفِ ماتم بچھا بیٹی ہیں تو جناب زینبؑ تشریف لاتی ہیں اور فرماتی ہیں۔

"اماں! تم آرام کرو۔ میں آ گئی ہوں۔ میں اپنے چاند کی صف ماتم بچھاتی ہوں"

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وفاتِ سیّدہؑ

حضراتِ محترم!

اللہ کا یہ فرمان ہے "ایمان والو! جب تم پر کوئی مصیبت پڑے تو اپنے اُللہ کو یاد کرو اِن لفظوں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن"

سامعین!

کائنات کی سب سے بڑی ہستی حضور سیدہ طاہرہ آج اس دُنیا سے رُخصت فرما چکی ہیں، اور آپ کی صاحب توفیق اولاد مومنین کی زیارت کیلئے آج جنازے کی شبیہ برآمد کرے گی تاکہ مومنین اپنے توکل کو پیدا کرکے حضور رسالت مآبؐ، حیدر کرارؑ اور سیدہ طاہرہؑ کے بچوں کو سیدہؑ کا پرسہ دیں سکیں۔

بزرگان محترم!

۲۸ صفر کو رسالت مآبؐ کی رحلت ہوئی اور آج ۳ جمادی الثانی کو تقریباً پچانوے دن بعد جناب سیدہؑ طاہرہ کی رحلت ہوئی۔ گویا تین مہینے سیّدہ نے اس دُنیا میں اس طرح گذارے ہیں کہ باپ کے زمانے کی زندگی بھی ان کے سامنے تھی اور باپ کی رحلت کے بعد کی زندگی بھی سامنے تھی۔ باپ کے سامنے کی زندگی کا یہ عالم تھا کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے کہ۔

جب آیۂ جہنم نازل ہوئی تو اپنی اُمّت کے درد سے رسالتؑ مآب نے رونا شروع کیا۔ اتنا روئے کہ کسی طرح حضور کا رونا رُکتا نہیں تھا۔ جب اصحابؓ نے یہ منظر دیکھا تو عرض کی۔

"یا رسُول اللہ! ہم اپنے سارے نیک اعمال اگر اُمّت کو دے دیں تو کیا گناہ گار بچ جائیں گے"

حضور نے فرمایا "نہیں"

بہر نوع جب کسی طرح رونا بند نہ ہوا تو سلمان فارسیؓ جناب سیدہؑ کے پاس پہنچے۔ دروازے کی کنڈی ہلائی۔ بی بیؑ نے پُوچھا۔

"کون!"

سلمانؓ نے عرض کی۔

"شہزادیٔ عالم! میں سلمانؓ ہوں"

"سلمانؓ! خیریت ہے"؟

سلمانؓ نے عرض کی۔

"شہزادی! آج خیریت نہیں، صبح سے تمہارے والد بزرگوار رو رہے ہیں۔ حضوؐر کا رونا کسی طرح رُکتا نہیں۔"

سیدہؑ نے فوراً برقعہ پہنا۔ پیروں میں موزے پہنیں۔ اور مسجد میں تشریف لائیں۔ سیدہ کو آتے دیکھ کر رسوؐل اپنے آنسو پونچھتے ہوئے تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ چند قدم بڑھ کر استقبال کیا اور پوچھا۔

"بیٹی! تو نے کیوں زحمت فرمائی ہے"؟

سیدہؑ نے فرمایا۔ "بابا جان! میں نے سُنا ہے، آپؐ صبح سے

رو رہے ہیں"

"ہاں بیٹا۔ آج ایسی بات تھی"۔ رسولؐ نے سیدہ کو اپنی جگہ بٹھایا اور خود سیدہ کے سامنے بیٹھ گئے اور پوچھا۔

"ہاں بیٹا۔ اب بتاؤ"۔

"بابا جان! آپ رو کیوں رہے ہیں!"

رسولؐ نے جواب دیا۔

"بیٹی! بات یہ ہے کہ آج آیۂ جہنم نازل ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ میری اُمت کے گناہ گار انسان جہنم میں جائیں گے بیٹا! اس وجہ سے رونے لگا ہوں"

سیدہؓ نے فرمایا۔

"بابا جان! آپ بالکل نہ گھبرائیں میں وعدہ کرتی ہوں کہ تیری بھی اُمت کے جو گناہ گار ہوں گے انہیں میں بخشاؤں گی۔

"بیٹا! تو کیسے بخشائے گی"؟

رسولؐ نے جب یہ پوچھا تو سیدہ قبلہ رو ہو گئیں اور دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا لئے۔

"خداوندا! میرے باپ بڑے پریشان ہیں ان کی اُمت کو بخش دے"۔

یہاں مولانا رُومؒ لکھتے ہیں۔

پس نگاہِ آمد زحاجت رسولؐ
من دُعائے فاطمہؓ کردم قبول

اللہ نے اسی وقت وحی کی "محمدؐ! فاطمہؓ کی دُعا

ہم نے قبول کر لی ہے۔"
اور باپ کی رحلت کے بعد کے حالات کچھ اس طرح تھے۔ کہ
باپؐ کے انتقال کو تین دن گذرے ہیں سیّدہ
کو رونے سے ہوش بھی نہیں آیا ہے۔ ابھی
پُرسہ دینے والی عورتیں چاروں طرف بیٹھی
ہیں۔ محمّدؐ کی یتیم بچی ابھی زمین پر ہی بیٹھی
ہے کہ آپ کو معلوم ہوا کہ میرے باپ نے ہمارے
گذارے کیلئے جو زمین دی تھی وہ حکومت نے ضبط
کر لی ہے۔"
یہ سُن کر سیّدہ نے یہ سوچا کہ شاید حکومت کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔
لہٰذا میں خود جا کر حاکمِ وقت سے کہتی ہوں تا کہ حکومتِ وقت کی غلط فہمی دُور
ہو جائے۔"
چنانچہ سیّدہ مسجدِ نبوی کے دروازے پہ تشریف
لائیں سامنے چادر پکڑے عورتیں کھڑی ہو گئیں
اور چادر کے پیچھے سے سیّدہ بڑے آرام سے فرماتی
ہیں:-
" میرے باپ کی مسجد میں بیٹھنے والو! تمہیں
میرے باپ کی عزت و عظمت یاد ہو گی۔
میں فاطمہؑ! تم سے اپنے باپ کے لہجے
میں کہہ رہی ہوں کہ میرا گذارا مجھے واپس
کر دو۔"

سامعین!

جب سیّدہ نے یہ فرمایا کہ:-

"میرا گذارا مجھے واپس کر دو" ——— تو حاکم وقت نے ایسا جواب دیا ہے کہ:-

"فاطمہؑ اپنے دونوں ہاتھوں سے دل پکڑ کے گھر واپس آ گئیں۔"

زینبؑ نے پوچھا:-

"امّاں! کیا جواب ملا؟"

سیّدہ نے فرمایا:-

"بیٹی زینبؑ! اُمت کے آج میں نے طور طریق ایسے دیکھے ہیں جن سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ تیری چادر کی خیریت نہیں۔"

اس کے بعد بی بی کو اتنا صدمہ ہُوا کہ آپ دوبارہ اُٹھ نہ سکیں۔ ہر وقت رونے میں گذرتا۔ امیر المومنینؑ تسلّی دیتے۔ گھر میں خواتین تسلّی دیتیں۔

سامعین!

آہستہ آہستہ وقت گذرتا گیا۔ جب ۲، جمادی الثانی آئی تو جناب سیّدہ کی طبیعت اتنی زیادہ خراب ہو گئی کہ جناب امیرؑ المومنین کو یقین ہو گیا کہ بیماری حد تک پہنچ گئی ہے۔

بہر نوع رات گذری۔ ۳ جمادی الثانی کا دن چڑھا۔ امیرؑ المومنین نے دیکھا کہ سیّدہ اُٹھیں غسل فرمایا۔ لباس بدلا۔ بچّوں کے کپڑے دھوئے پھر بیٹی کا سر دھویا حسنینؑ کو نہلایا۔ بچّوں کے کپڑے بدلے۔ گھر میں صفائی کی،

دو تین دن کا کھانا پکا کے رکھا۔ امیر المومنین نے سیدہ کو جب اس طرح گھر کا کام کرتے دیکھا تو مسکرا کے فرمایا: "ما شاء اللہ"۔ رسول کی بیٹی! آج طبیعت ٹھیک معلوم ہوتی ہے"

بی بی نے فرمایا:-
"یا علیؑ فکر نہ کرو۔ آج عصر تک طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی"

علیؑ نے پوچھا "کیا بات ہے!"

سیدہ نے فرمایا:-
مَیں نے رات اپنے باپ کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ مجھے فرماتے تھے
"فاطمہ! مَیں تیرے استقبال کو آیا ہوں"
لہٰذا آج میں اپنے باپ کی خدمت میں جا رہی ہوں۔ مَیں نے اسلئے بچوں کو نہلا دیا ہے تاکہ میرے صدمے میں پریشان ہو کر کہیں بچے رُل نہ جائیں اور اُن کے چہرے پہ یہ نہ بن پائے کہ یہ بن ماں کے ہو گئے ہیں۔ میں نے زینبؑ کے بال اس لئے دھلا دیئے ہیں کہ معصوم بچی اپنے بال دھو نہ سکے گی۔ مَیں نے حسنینؑ کو لباس اس لئے پہنا دیئے ہیں تاکہ مَیں انہیں بھی شکستہ نہ دیکھوں اور مَیں نے دو دن کا کھانا بھی پکا کے رکھ دیا ہے کہ میں اپنے بچے فاقہ سے نہ دیکھ سکوں۔"

سیدہ کے یہ الفاظ سُن کر علیؑ کا دل ٹوٹ گیا۔ مسجد میں تشریف لائے دعائیں پڑھنا شروع کیں۔

سامعین!

جب آج کا دن ڈھلا تو سیدہ طاہرہ نے عائشہؓ اور فضہؓ کو بلایا اور فرمایا:-

"تم دونوں خواتین میرے بچوں کو ذرا باہر بلا دو۔ میں اپنے حجرے میں جا رہی ہوں" تم بچوں کو اندر نہ آنے دینا۔

چنانچہ یہ دونوں خواتین شہزادوں کو باہر لے کر بیٹھ گئیں۔ سیدہ حجرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد چھوٹے شہزادے نے کہا۔

"اماں فضہؓ! میں اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں"

اب فضہؓ کی کیا مجال کہ شہزادے کو روکے۔ اُدھر سیدہ کہہ رہی ہیں کہ "بچوں کو آنے نہ دینا" اِدھر حسینؑ کی یہ ضد کہ "میں جانا چاہتا ہوں"۔

بہر نوع حسینؑ حجرے کا دروازہ کھول کر اندر تشریف لائے۔ دیکھا کہ سیدہ کا سر سجدے میں ہے اور بڑی نحیف آواز میں کہہ رہی ہیں۔

"سُبحان ربی الاعلیٰ"

ایک منٹ تو حسینؑ نے دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کے ماں کا سر گود میں لے لیا اور کہا۔

"اماں! میں حسینؑ ہوں۔ مجھ سے بات کرو"

ماں نے آنکھیں کھول کے بیٹے کو دیکھا اور فرمایا "حسینؑ بیٹا! صبر کرو"

یہی یہ آخری فقرہ تھا جو ماں بیٹے سے کہہ چکی۔ حسینؑ نے ماں کا سر سجدے میں رکھ دیا۔

سامعین!

پچاس سال بعد تاریخ نے اپنے آپ کو دُہرایا۔ آج حسینؑ نے فاطمہؑ کا سر سجدے سے اٹھا کے اپنی گود میں لیا اور فاطمہؑ نے کہا "حسینؑ بیٹا! صبر کرو" ——— اور پچاس سال

بعد کربلامیں حسینؑ کا سر سجدے سے اُٹھا کے فاطمہؑ نے گود میں لیا اور حسینؑ نے کہا۔ "اماں ! صبر کرو"

بہر نوع حسینؑ باہر تشریف لائے۔ تھوڑی دیر بعد فضہؓ اندر گئیں اور سیدہ کو دیکھ کر باہر نکلی اور سیدھی مسجد میں گئی۔

"یا علیؑ! قالو اِنا لِلّٰہِ وَ اِنا اِلیہ راجِعون"

"یا علیؑ! ہماری کائنات لٹ گئی"

"یا علیؑ! دُنیا ہمارے لئے تاریک ہو گئی"

"یا علیؑ! آج ایمان یتیم ہو گیا"

"یا علیؑ! آج قرآن بے قاری ہو گیا"

"یا علیؑ! آج محمدؐ کا دین ویران ہو گیا"

"یا علیؑ! آج سیدہ اپنے باپؐ کے پاس چلی گئیں"

علیؑ بغیر نعلین کے، بغیر عمامہ کے، مسجد سے اُٹھے اور گھر میں آئے اور دیکھا کہ سیدہ کی رحلت ہو چکی ہے۔ اس وقت علیؑ نے ایک مرثیہ پڑھا ہے جس کا مطلب یہ تھا۔

"اے رسولؐ کی بیٹی! اس بھری دنیا میں تم مجھے تنہا چھوڑ گئیں۔ اب میں بالکل تنہا رہ گیا۔ اب تیرے بچوں کی نگہبانی کون کرے گا۔ اور مجھے تسلی کون دے گا؟"

اس کے بعد امیرالمؤمنین نے فرمایا "اُمِّ فضہؓ، عائشہؓ، غسل، کفن کا انتظام کرو"

سامعین!

اتنے میں رات ہو گئی۔ جب کفن پہنا چکے اور جنازہ تیار ہو گیا تو

امیرالمومنینؑ نے فرمایا۔

"فاطمہؑ کے بچوں کو بلاؤ"۔

چنانچہ بچے تشریف لائے۔ علیؑ نے سب سے پہلے حضور حسنؑ مجتبیٰ سے فرمایا۔

"حسنؑ بیٹا! تمہاری ماں کی وصیت تھی کہ جنازہ رات کو اٹھایا جائے"۔

لہذا آج رات تھوڑی دیر بعد جنازہ اٹھا لیا جائے گا۔ تو اپنی ماں کا آخری دیدار کر لے"۔

چنانچہ حسنؑ آگے بڑھے۔ ماں کا منہ دیکھا۔ بدن میں لرزا پیدا ہوا۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑے اس کے بعد امیرالمومنینؑ نے فرمایا

"حسینؑ بیٹا! آؤ۔ تم بھی ماں کا منہ دیکھ لو"۔

حسینؑ جواب میں فرماتے ہیں:۔

"بابا جان! کیا میری ماں کی عزت مریمؑ سے کم ہے؟

علیؑ نے فرمایا۔

"نہیں بیٹا۔ بلکہ زیادہ ہے"۔

"بابا جان! اگر مریمؑ نے جنازے میں عیسیٰؑ سے بات کی تھی تو کیا میری ماں مجھ سے بات نہیں کر سکتی۔ میں اس شرط سے ماں کے پاس جاؤں گا کہ وہ خود مجھے پکارے"۔

حسینؑ نے یہ کہہ کے سیدہ سے خطاب کیا:۔

"اماں! مجھے آواز دے"۔

بی بی نے کوئی آواز نہ دی۔ پھر حسینؑ بولا:" اماں! مجھے پکارو"۔

پھر بھی جواب نہ ملا۔ آخر حسینؑ نے پورے جوش سے کہا:۔
"اماں! تجھے میری ہی قسم، مجھے آواز دو۔"
اب جو حسینؑ نے یہ کہا تو سیدہ کا جنازہ تڑپ اٹھا اور سیدہ نے "ہائے" کہہ کے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور حسینؑ ماں کی میت کے سینے پہ جا کے لیٹ گئے اور سیدہ نے دونوں ہاتھ حسینؑ کی کمر پر رکھ دیئے۔ تمام شہر مدینہ میں زلزلہ آنے لگا۔ علیؑ نے بڑھ کر حسینؑ کو گود میں اٹھا لیا "حسینؑ بیٹا! اگر تم تھوڑی دیر اور ماں سے لپٹے رہے تو قیامت آجائے گی۔"
امیرالمومنین پوچھتے ہیں:۔
"بیٹا! ماں سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"
حسینؑ جواب میں فرماتے ہیں۔
"بابا جان! میں اماں سے وعدہ لے رہا تھا کہ اماں اس وقت تو تم جا رہی ہو مگر جب میرا آخری وقت ہوگا تو آئے گی نا۔"
پھر تو ع جب جناب امیرالمومنین نے حکم دیا کہ سیدہ کا جنازہ اٹھاؤ۔ فضہ نے عرض کی:۔
"مولا! اگر آپ اجازت دیں تو میں بنی ہاشم کی عورتوں کو بلاؤں۔"
آپؑ نے فرمایا "کسی کو نہ بلاؤ۔ ہمارے جنازے اس طرح نہیں اٹھیں گے۔"
سامعین! رسولؐ کا جنازہ تنہا علیؑ نے دفن کیا۔ علیؑ کا جنازہ

حسنینؑ نے دفن کیا۔ حسنؑ کے جنازے پہ تیر برس گئے
اور حسینؑ کے جنازے پہ جو گذری وہ دُنیا کو معلوم ہے۔ اُدھر
آج سیدہ کا جنازہ اس طرح اٹھا کہ ایک طرف تو خود اٹھا ہُوا تھا اور دوسری
طرف سے علیؑ نے اٹھایا ہُوا تھا اور دو بچے جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہے
تھے۔ حسنینؑ نے پوچھا۔

"بابا جان! آپ نے آنکھیں کیوں بند کی ہُوئی ہیں۔؟

امیرالمومنینؑ نے جواب دیا۔

"شہزادو! تمہارے نانا نے جنازہ اٹھایا ہوا ہے اور میری شرم سے آنکھیں
بند ہیں کہ کہیں رسولؐ مجھ سے یہ نہ پوچھ بیٹھیں۔

"علیؑ! میرے بعد تُو نے میری بیٹی کی کیا حفاظت کی؟" تو میں کیا
جواب دوں گا۔ اس لئے میں نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں"

اب جو علیؑ نے یہ کہا تو حسنینؑ فرماتے ہیں۔

بابا جان! کیا ہم اتنے غریب ہو گئے ہیں کہ ہمارا جنازہ بھی چار
آدمی نہیں اٹھا سکتے۔"

علیؑ نے فرمایا حسنینؑ بیٹا! فکر نہ کرو۔ آج تم پر غربت ہے کہ
تمہاری ماں کے جنازے میں کوئی شریک بھی نہیں ہُوا۔ مگر قیامت تک
تک تمہاری ماں کا جنازہ اٹھاتی رہے گی اور اتنا ماتم ہوگا کہ دُنیا میں کسی جنازہ پہ
نہ ہُوا ہوگا۔

سامعین!

علیؑ کے اس فرمان کے مطابق آج فاطمہؑ کے بیٹے سیدہ زادے اور
سیدانیاں سیدہ کا جنازہ اُٹھائے کہہ رہے ہیں۔

• مولا ! اگر اس وقت ہم موجود ہوتے تو فاطمہؑ کا جنازہ ہم اسی شان، عظمت اور وقار سے اُٹھاتے جس طرح ہم آج اُٹھا رہے ہیں۔

جنازے کے ساتھ سید بھی ہیں۔ سیدانیاں بھی ہیں اور میں سیدانیوں سے اِلتجا کرتا ہوں کہ جب جنازہ زنان خانے میں جائے گا تو ننگے سر اس جنازہ کو اُٹھائیں اور زینبؑ کو سیدہ کا پُرسہ دیں

" بی بی زینبؑ ! تیری اماں کا جنازہ تیری کنیزوں نے اُٹھایا ہوا ہے؟"

سیدہ کی بیٹیو !

یہ اُس غریب کا جنازہ ہے جس کا جنازہ اُٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔ آج ہمارے لئے قیامت کی رات ہے۔ آج رسولؐ قبر سے باہر تشریف لائے ہیں۔ آج علیؑ کے سر پہ عمامہ نہیں ہے۔ آج زینبؑ کے سر پہ چادر نہیں ہے۔ آج حسنینؑ یتیم ہو چکے ہیں۔ آج زینبؑ کے بال کھُلے ہوئے ہیں حوریں ماتم کر رہی ہیں اور علیؑ آواز دے رہے ہیں۔

• کہاں ہو میرے پیارے سیدزادو !

آؤ اپنی دادی کے جنازے کو کندھا دو۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

maablib.org

پروردۂ آغوش رسالتؐ

خداوند عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمدؐ و آل محمدؐ پر درود و سلام

سامعین کرام!

خداوند عالم نے اپنے خاص فضل و کرم سے دُنیائے انسانیت کو انسان کے اپنے قائم کردہ اصول و ضوابط سے نجات دلا کر ایک ایسا ہمہ گیر اور عالمگیر نظام حیات عطا فرمایا ہے کہ جس پر عمل کرنے سے ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے اور کوئی انسان اپنی مادی طاقت کے بل بوتے پر کسی دوسرے انسان پر حکومت نہ کر سکے۔ گویا اس عدل اور مساوات انسانی پر قائم نظام کا نام اسلام ہے۔

اسلام ہی وہ دین ہے، اسلام ہی وہ طریقۂ حیات ہے جس نے تمام انسانوں کو اخوت و برادری کے مضبوط رشتہ میں منسلک کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں پر فوقیت صرف اس صورت میں رکھتا ہے کہ وہ جتنا زیادہ متقی ہوگا۔ اچھے اخلاق سے آراستہ ہوگا، اپنے خدا سے قریب ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ باعزت ہوگا۔

حضور والا!

یہی وہ نظام تھا جس کو قبول کرنے کے لئے وہ طبعیتیں آسانی سے تیار نہ تھیں جن کی نسلیں محض مادی برتری کی بنا پر لوگوں پر حکومت کرتے

گذریں یا جنھوں نے دوسروں کی کمائی پر عیش کیے اور جو صرف مادی طاقت کے بھروسے پر دوسرے لوگوں پر بلا وجہ مسلط رہے نتیجہ یہ نکلا کہ بانیٔ اسلام کی رحلت کے کچھ ہی دن بعد وہ جاہلی نظام، وہی انسان پر انسان کی حکومت وہی تفوّق و برتری کا جذبہ، وہی انسانی ذہنی غلامی (گویا یہ سب چیزیں) یزیدیت و ملوکیت کی شکل میں دنیا کے سامنے آگئیں۔ اس کا سب سے بڑا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ ایک طرف یزید ملوکیت کی بہترین شکل کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے کو خلیفۃ المسلمین، رسولؐ کا نمائندہ اور اللہ کا نائب بھی قرار دیتا تھا اور دوسری طرف مسائل شرعیہ اور فرمانِ خدا اور رسولِ خدا کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ گویا یزید کی اس ظالمانہ اور جابرانہ حکومت کو تسلیم کے معنیٰ یہ تھے کہ یہ مان لیا گیا ہے کہ خدائی نظام یہی ہے، اور اسلام کی تعلیم یہی ہے۔

سامعین!

یزید کی اس ظالمانہ روش کو چاہے ساری دنیا تسلیم کرے یا نہ کرے مگر پروردۂ آغوشِ رسالت فاطمہؑ کے دودھ سے پلا ہوا انسان جس کے رگ و ریشہ میں صحیح اسلامی روح سرایت کیے ہوئے تھی جو اسلام کی جیتی جاگتی ایک تصویر تھا جس نے بانیٔ اسلام کے سینے اور کاندھوں پر کھیل کر پرورش پائی تھی۔ جس نے پیدا ہوتے ہی زبانِ رسالت چوس کر پہلی غذا حاصل کی تھی، جس کو رسولؐ نے جوانانِ جنت کا سردار کہا تھا۔ باغیرت باپ کا باغیرت بیٹا اور دنیا کے سب سے عظیم انسان کا عظیم نواسہ! کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ایک جابر و ظالم حکمران اپنی حکمرانی کے غرور میں اسلامی اصول کو پامال کر کے دنیا کے سامنے یہ ثابت کرے کہ انسان کی ذہنی غلامی ہی اسلام کی تعلیم تھی۔ لہٰذا وہ محسنِ اعظم اس اصول کو ختم کرنے کے لئے اور اس اصول کی اطاعت نہ کرنے

کے لئے اور ہر قسم کی مصیبتوں اور آفتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدانِ عمل میں اُتر آیا۔

یاد رکھو!

حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی ان تمام خوبیوں کا مظہر ہیں جن کے نام کے اندر تمام اخلاق حسنہ مضمر ہے۔ آج دنیائے انسانیت کا عظیم ترین ہیرو اور مسلمانوں کا مایہ نازانسان اور دُنیائے اسلام پر حکومت کرنے والا شہید یعنی حسینؑ ابن علیؑ محض اس لئے اپنے خوبصورت بچوں اور اہل وعیال، دل کے ٹکڑوں اور اپنے جگر گوشوں کو لیکر میدان عمل میں اُتر آیا کہ میرے نانا نے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے جس عادلانہ نظام کی بنیاد رکھی تھی وہ ایک شخص کے ہاتھوں مٹ رہا ہے جسے میں مٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ گویا حسینؑ کی یہ جنگ نہ تھی بلکہ اصُول کی خاطر ایک جہاد تھا۔

عزاداری سید الشہداء

خدا نے اس عظیم جہاد کے لئے یوم عاشور سنہ ۶۱ھ کی تاریخ مقرر فرمائی تھی۔ کربلا کا چٹیل میدان، ریگزار اور بیابان جنگل جس میں انسان گذرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مگر قدرت اپنی حکمت سے اس جنگل کو اس خیر وشر کے معرکہ کے بعد عرشِ معلیٰ کا ہمسر بنانا چاہتی تھی۔ لہٰذا آج حسینؑ اپنے عزیز ترین متاع کو لئے ہوئے اس بیابان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف دشمن کی مادی طاقت کی پوری یلغار حکومت کی منظم فوجوں کی یورش، خزانوں کے مُنہ کھلے ہوئے بے شمار تلواروں کی جھنکار بے انتہا نیزوں کی جھلک اور ہزاروں کمانوں کا کھینچنا اور دوسری طرف بہتّر بھوکے پیاسے جن میں بوڑھے بچے اور کمزور عورتیں ہی کو لئے ہوئے دُنیا کا سب سے بڑا اخلاقی طاقت کا مظہر انسان، انسانی مساوات کا سب سے

بڑا علمبردار اور رسولِ اسلام کے کندھوں پر کھیل کر جوان ہونے والا انسان اپنی بظاہر کمزور فوج کو لیکر دُنیا کی سب سے بڑی طاقت سے نبرد آزما ہونے کے لئے کربلا میں موجود رہے۔

بزرگانِ من!

چشمِ فلک نے ستاروں کی عینک لگا کر دیکھا کہ شام عاشور فوجِ یزید اپنی ظاہری فتح کا جشن منا رہی تھی۔ "ہائے ہو" اور شور و شر سے کربلا کا میدان گونج رہا تھا اور ایک طرف خیموں کی جلی ہوئی راکھ اور گرم ریت پر شریف ترین انسانوں کے بے گور و کفن لاشے ہیں اور کچھ بے کس و بے سہارا عورتیں عالم قید میں ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں خاموش بیٹھی ہیں۔ دُنیا تو یہ سمجھی تھی کہ حق کو شکست ہو گئی ہے اور باطل نے اپنی فتح کے شادیانے بجا لیئے، مگر آج کا بیدار مغز مؤرخ اس وقت بھی لکھ رہا تھا اور آج بھی لکھ رہا ہے کہ حق شکست کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ حق کبھی نہیں ہارتا۔ آج دُنیا نے دیکھ لیا کہ حسینؑ کو فتح ہوئی ہے اور یزید کو بُری طرح شکست ہوئی ہے۔ گویا دنیا کے سب سے بڑے آمر (DECTATOR) کا نام آج گالی بن گیا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص یزید یا ولدِ یزید بننا اپنے لئے گوارہ نہیں کرتا۔ مگر کروڑہا انسان حسینؑ کی غلامی پر آج بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ گویا حسینؑ قیودِ مذہب و ملت اور جغرافیائی حدود سے آزاد ہو کر دنیائے عالم کے تمام انسانوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے اور آج کرۂ ارض پر کروڑہا انسان حسینؑ کی اس عظیم قربانی کی یاد منا رہے ہیں اور تمام زمین و فضا آج "ہائے حسینؑ" اور "واہ حسینؑ" کے نعروں سے گونج رہی ہے۔ "آج حسینیتؑ زندہ باد" کی ابدی صدا ہر انسان کے کان میں آ رہی ہے۔ گویا یہ وہ فتح عظیم ہے جو حسینؑ کی شہادت عظمیٰ نے حاصل کی۔

نوجوانو!

خوب یاد رکھو! حسینؑ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ انسانی غلامی ایک آرہے ایک ذِلّت ہے اور اس ذلّت کی زندگی سے مرجانا ہی بہتر ہے اور اللہ کے "وحدہٗ لاشریک لہٗ" دروازے پر سر جھکانے والا انسان کبھی کسی طاغوتی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔ اس کا سر کٹ تو سکتا ہے مگر جھک نہیں سکتا۔ اس کا سَر نوکِ نیزے پر بلند تو ہو سکتا ہے مگر یزیدیّت کی اطاعت قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی بہنیں اور بیٹیاں قید تو ہو سکتی ہیں مگر ظالم و سرکش کے دربار میں اعلانِ حق کی طاقت سے ملوکیّت کے درباروں کی چھت نہیں ہلا سکتی ہیں۔

سامعین!

حسینؑ نے اپنے جوانوں، بیٹوں اور بچوں کا خون دیکر اسلام کو اتنا قوی بنا دیا ہے کہ قیامت تک اسلام کی جڑوں کو کوئی طاغوتی طاقت کھوکھلا نہیں بنا سکتی بے شک ظلم و استبداد کہیں کہیں آج بھی زندہ ہے اگر

یاد رکھو!

اس ظلم کے خلاف آج بھی حسینؑ کی آواز بلند ہو رہی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔ لہٰذا آج ہم حسینؑ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

حسینؑ! تو نے دنیا میں ایک ایسا باغ لگا دیا ہے جس کے پھل انسانیت کو ہمیشہ ملتے رہیں گے اور جس کے درختوں کے زیرِ سایہ ستائی ہوئی انسانیت ہمیشہ پناہ لیتی رہے گی!

حسینؑ! تیرا نام انسانیت کو پناہ دینے کا ضامن ہے۔

حسینؑ! تیرا ذکر انسانیت کی سربلندی کا ذریعہ ہے۔

حسینؑ! تیرے ماتم کی صدا دنیائے انسانیت کو سکون بخشتی ہے

حسینؑ! تیری یاد انسان کو کھویا ہوا مقام دلاسکتی ہے۔
حسینؑ! تیری محبت ہم گناہ گاروں کا ذریعہ شفاعت ہے۔

اصحابِ حسینؑ

* فرزند رسولؐ پر ایثار و قربانی کا عظیم جذبہ
* تاریخ انسانیت کا حسین ترین واقعہ
* مودۃ فی القربیٰ کی عمدہ مثال
* ارباب منبر کے لئے بہترین خزینہ

اٹھارہ آلِ ابی طالبؑ

* اولاد ابی طالب اور تحفظ زریت رسولؐ
* شہیدان کربلا کی خونیں داستان
* تاریخ اسلام کے طلباء کے لئے عمدہ تحفہ
* ارباب منبر کے لئے شاندار خزینہ

(ناشران)

سبطِ زہرا اکیڈمی، مُرادآباد، پوسٹ آفس سندیلیانوالی ضلع
ٹوبہ ٹیک سنگھ (پاکستان)

یزیدیت کیا ہے ؟

یزیدیت ! خدا کے قائم کردہ نظام حیات کے خلاف ایک بغاوت

یزیدیت ! دور ملوکیت کی ایک زہریلی ناگن

یزیدیت ! عالم انسانیت کے منہ پر ایک طمانچہ

یزیدیت ! تاریخ اسلام کے ماتھے پر ایک بدنما دھبہ

"یزیدیت بوکھلا اٹھی" میں ملوکیت کے پس منظر میں یزیدیت کے بنیادی محرکات پر مختلف مکاتب فکر کی آراء میں تنقیدی بحث کی گئی ہے

"یزیدیت بوکھلا اٹھی" میں شہادت سید الشہداء و ناصران دین خدا کی قربانیوں اور دختران علیؑ و فاطمہؑ کے ان تاریخی خطبات کو سپرد قلم کیا گیا ہے جنہوں نے یزیدیت کی ظاہری فتح کو ملوکیت و آمریت کا پس منظر قرار دیا اور دنیا کے سب سے بڑے آمر کا نام گالی بنوا دیا کہ آج اولاد یزید بھی اپنے لئے اولاد یزید کہلانا گوارا نہیں کرتی

"یزیدیت بوکھلا اٹھی" میں یزیدیت کا عبرتناک انجام، مرگ یزید اور قاتلانِ سید الشہداء پر قہر خداوندی کا تذکرہ کیا گیا ہے جو امیر مختار ثقفی کے روپ میں تاریخِ اسلام کے صفحات پر نمودار ہوا

"یزیدیت بوکھلا اٹھی" میں تاریخ اسلام کے بھیانک دور کے خونخوار یزید (یزید) کی اصل حقیقت خدا و رسول خدا اور بزرگان اسلام و منکرین مغرب کی آراء میں بیان کی گئی ہے۔ گویا یہ کتاب تاریخ اسلام کے لئے ایک خزینہ ہے اہل علم حضرات کے لئے ایک دعوتِ فکر ہے اور ارباب منبر کے لئے ایک عمدہ تحفہ ہے (طباعت و کاغذ اعلیٰ)

ناشر [illegible] ۳۰ دوسرا آفس شہداء قوانی ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان

حضرت مولانا السید اظہر حسن زیدی مدظلہٗ کی شہرہ آفاق تقاریر کا

آخری مجموعہ

مرتبہ :- خضر عباس سید ایم اے

☆☆☆

- ★ مودۃ فی القربیٰ کا مکمل تعارف
- ★ شہدائے کربلا کی خونیں داستان
- ★ اہل علم حضرات کے لئے دعوت فکر
- ★ ارباب منبر کے لئے شاندار خزینہ
- ★ خطیب آلِ محمدؐ کے فن تقریر کا بہترین نمونہ

عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے

maablib.org

ناشر: مُعلّم پبلشنگ کمپنی۔ اُردو بازار۔ لاہور